

U100316.

12-12-09

Title - AIRAAR-E-GUL

Creator - Musattiles Zameer Ahmad Hashmi.

Publisher - (Rampur)

Date - 1944

Pages - 367.

Subjects - Rampur - Tarikha, Shora; Usdu Shaghai-
Jatikhat.

اوراقِ گل

نرم سخنِ مہوینِ حسیہ و لے شعرا کے چید کلام اور مختصر حالاتِ زندگی کا مجموعہ

ترتیب

ضمیر احمد دہاشمی

الحکم



علی حضرت فرما روئے رامپور دام اقبالہم و ملکھم

CHECKED-2002

۱۰۰ ۳۱۴

ES



SEP 1988

گیسوتے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U100316

قیمت: ۷۵/-

مضامین

- ۱ - تقریب ۵-۱
 ۲ - ویباچہ مرتب ۸-۴
 ۳ - کلام ہندگان اعلیٰ حضرت دام اقبالہم و ملکہم م
 ۴ - کلام ہر پائش دام اقبالہا س

۳۵۲-۱

تذکرہ شعرا

۱۸۵	رضا لکھنوی	۱	آرزو لکھنوی
۱۹۵	روشن صدیقی	۱۳	آزاد انصاری
۲۰۹	ساحر دہلوی	۲۵	اثر رامپوری
۲۱۹	ساغر نظامی	۳۵	اثر صہبائی
۲۳۱	سائل دہلوی	۴۷	اثر لکھنوی
۲۴۳	سیاہ اکبر آبادی	۵۹	احسان دانش
۲۵۷	صفی لکھنوی	۷۱	اختر شیرانی
۲۶۷	فراق گورکھپوری	۸۷	ابین حزیں
۲۷۹	کیفی دہلوی	۹۷	بچود دہلوی
۲۹۷	ماہر القادری	۱۱۱	نائب لکھنوی
۳۰۷	مخدوم	۱۲۳	جگر مراد آبادی
۳۱۹	ملا لکھنوی	۱۳۵	جلیل مانگیپوری
۳۲۳	نوح ناروی	۱۴۷	جوش یلح آبادی
۳۴۵	وحشت کلکتوی	۱۵۹	حسرت موہانی
		۱۶۹	حفظ جالندھری

۳۶۷-۵۳۳

اشعار

۳۶۲	۳- مقامات	۳۵۵	۱- اشخاص
۳۶۴	۴- ادارے	۳۶۱	۲- اقوام و فرق

۵- کتب وغیرہ - ۳۶۵

تقریب

ریاست عالیہ مصطفیٰ آباد (رام پور) ہمیشہ سے علم و ہنر کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ شاعروں میں سے اکثر نے اس کے والیوں کے دامنِ لطف و کرم میں پناہ لے کر اپنے فن کی آبپاری کی اور قائم و مضحیٰ سے امیر و داغ تک اسی دربار کی قدردانی و قدر افزائی سے آسمانِ شہرت پر چکے۔

اس خصوص میں نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس سکاں نظمِ تخلص اور نواب سید کلب علی خاں بہادر خلید آشیاں نواب تخلص کا عہد بہت ممتاز ہے۔ ان ادب پروروں نے خزاں دیدہ و ستم رسیدہ ہندوستان کے تمام علمی جواہر پارے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے، اور بے یار و مددگار اہل ادب کی خاطر خواہ دلجوئی و مدارات کی تھی۔ یہ دونوں خود عالم، ادیب اور شاعر تھے۔ اپنی شبانہ صحبتوں میں شعرو سخن کے لیے مناسب وقت نکال کر تفوق جویوں کو موقع دیتے تھے کہ اپنی محنتی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس فن کو نمایاں شان ترقی دیں۔ اس تفوق جوئی ہی کا یہ خوشگوار نتیجہ تھا کہ دبستانِ دہلی و لکھنؤ کے حامیوں کے دن رات کے ادبی تصادم سے شعرو سخن کا ایک

ب

نیا اسلوب پیدا ہو گیا۔

نواب سید حامد علی خاں بہادر جنت مکان رشک تخلص کے وسط
عہد تک شعر و سخن کی پرورش کو ریاست کے مشاغل میں برابر جگہ
حاصل رہی۔ اس کے بعد جدید شاعری کے بڑھتے ہوئے ذوق نے
شعر کو دربار سے باہر نکال کر عوام سے روشناس کرایا، تو بعض نئے
رجحانات کے باعث شعر اور دربار کے تعلقات میں ایک گونہ متغیّر
پیدا ہو گئی۔

— ریاست رام پور نے ہنگامِ ہمایون اعلیٰ حضرت دامت اقبالہم و ملکہم
کے زیر سایہ جو نمایاں ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔
آغازِ عہدِ مبارک سے حضورِ انور کا یہ ایسا رہا ہے کہ رامپور
کے علی نشاۃ ثانیہ کی طرف بھی عملی قدم اٹھایا جائے۔ اہل رامپور
نے اساتذہ قدیم سے استفادے میں قابلِ قدر جوش اور ولولے
کا ثبوت دیا تھا، جس کا خوش آئند نتیجہ عبیر شاہ خاں عبیر و آشفستہ
میاں نظام شاہ نظام، صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بنیاب، محمود
خاں محمود، احسان علی خاں احسان اور حکیم عبدالہادی خاں وفا کی
شاعری ہے۔ موجودہ تعلیمی ترقی کے دور میں رامپور کے نوجوان طبقہ
شعرا سے زیادہ خوش آئند توقعات وابستہ تھیں۔ چنانچہ ایسے
ہمایوں کی تعمیل میں ترقی خواہ کو مناسب معلوم ہوا کہ شعرا سے رامپور
اور مستند بیرونی اساتذہ شعر کے درمیان رابطہ اتحاد و اعانت پیدا
کر کے دبستانِ رامپور کی از سر نو تاسیس کی جائے۔

میرے رفقاءے کار نے اس تجویز کو پسند کیا اور اکمل ادنیٰ

مجلس بزم سخن کے نام سے قائم ہوگی۔ اس بزم نے دو سال کے اندر رامپور میں متعدد یادگار معیاری شاعرے منعقد کئے اور اس طرح نوجوانوں کی رہنمائی ذوق کا نیا باب کھول دیا۔ یہ مجلسیں اپنی نوعیت کی بے مثال صحبتیں تھیں جن کی نہ صرف یاد شرکا کے دلوں میں تازہ گیت باقی رہے گی، بلکہ نوجوان شاعروں پر ان کا اثر بھی پایدار اور دور رس مرتب ہوگا۔ بالخصوص اس بنا پر کہ علامت حضرت اور علیا حضرت دام اقبالہم و ملکہم نے اپنی شاہانہ توجہ اور سپہم نوازش سے ان جلسوں کے شرکا کو معزز فرمایا تھا۔

بزم سخن نے ان جلسوں کی روداد کو زیادہ ہمہ گیر مفید اور دلچسپ بنانے کے خیال سے یہ بھی طے کیا تھا کہ آخر میں ایک ایسا مجموعہ شائع کیا جائے جس میں شریک مشاعرہ اساتذہ کا چیدہ کلام اور شبیہ اور عکس خط کے ساتھ مختصر حالات درج ہوں۔ زیر نظر کتاب وہی مجموعہ کلام ہے جسے سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ رامپور کے چٹھے نمبر کے بطور چھاپ کر حضور انور میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف میں عالی مرتبت خان بہادر ضمیر احمد ہاشمی صاحب بہادر ڈپٹی ریونیو منسٹر نے جس محنت اور کاوش سے کام کیا ہے وہ مستحق تحسین ہے۔ اگر انھیں بزم سخن کے مقاصد سے کما حقہ دلچسپی اور اُن کی تکمیل میں مناسب اہتمام و شغف نہ ہوتا، تو موجودہ دور ابتلا میں بزم کی دو سالہ کارگزاری کا یہ خوش منظر نتیجہ کبھی نہ نکل سکتا۔

دیباچہ

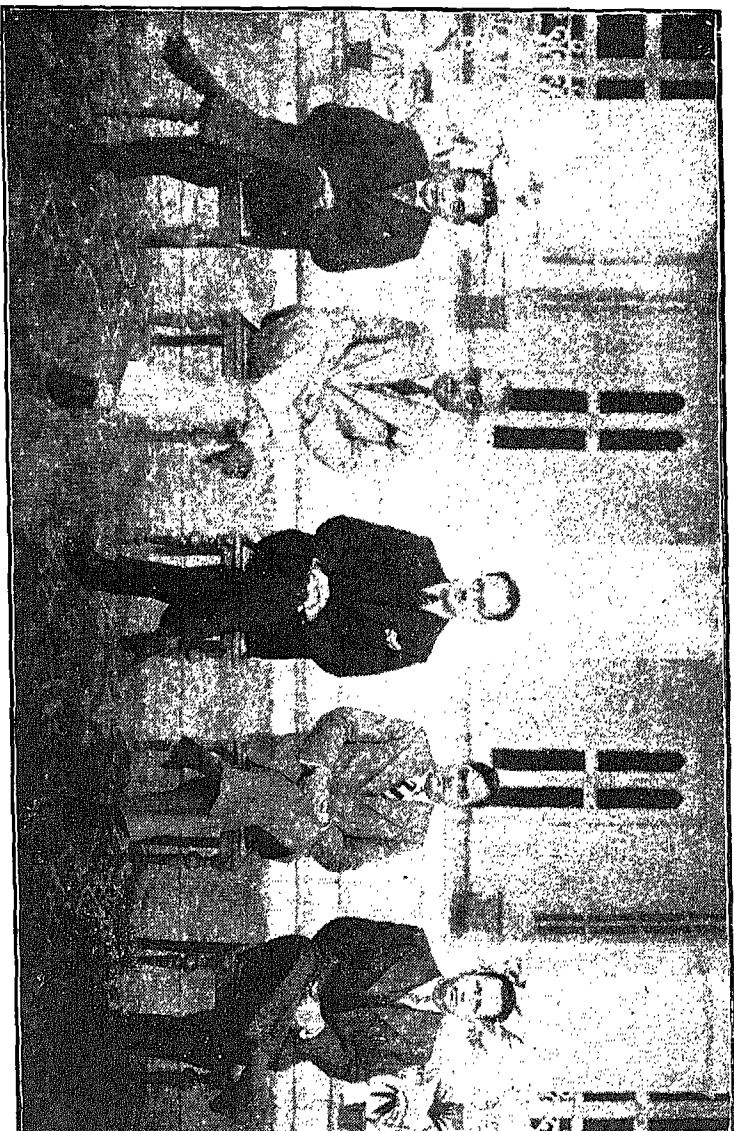
دلی کے اقبال کا سورج گہن میں آیا اور یہاں کی بساطِ حکومت
اُلٹی تو اُس کے مہرے ادھر ادھر بکھر گئے۔ کچھ حیدر آباد اور بیشتر لکھنؤ
پہنچے جہاں محفل ابھی گرم تھی اور نواب وزیر کی فیاضی ان باکمال
پردیسیوں کے زخم پر مرہم کا کام کر رہی تھی۔ خان آرزو، مرزا رفیع
السودا، میر تقی میر، میر سوز، انشاء اللہ خاں انشا اور قلندر بخش جرات،
انھیں باکمال پردیسیوں کے قافلہ سالار شمار کیے جاتے ہیں۔

زمانہ بدل رہا تھا۔ ملک میں نئی نئی قوتیں کار فرما تھیں۔ لفظوں کی
پھریاں اور محاوروں کی جنگیں ان کا مقابلہ نہ کر سکیں، اور لکھنؤ کی بہا
میں بھی خزاں آگئی۔ شاعروں نے پھر اپنی اپنی بیاضیں بغل میں داہیں
اور آسرے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر ڈالی۔ شمالی ہند میں صرف
مصطفیٰ آباد رامپور کی سرکارِ قدردان نظر آئی، جس کا سایہ ہندوستانی
اقبال کے ڈھلنے ہوئے سورج میں دلی اور لکھنؤ تک پہنچ رہا تھا۔
اہل ادب کا یہ لٹا پٹا قافلہ ادھر چل پڑا۔ دربار نے ان باکمالوں
کو اپنے سایے میں جگہ دی اور جو محفل لکھنؤ سے برہم ہوئی تھی، وہ
یہاں قائم ہو گئی۔

میرزا غالب مرتے دم تک اسی دربار سے وابستہ رہے۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال کی شاعری ہمیں پروان چڑھی۔ دربار نے اُن کو طح طرح سے نوازا، اُنھوں نے شاعری کو رنگ رنگ سے سنوارا۔ آخر کا لکھنؤ اور دہلی کے اثر سے زبان اور منہج گئی، روز مرہ صاف ہوا اور اور اہل رامپور کے ادبی ذوق کی ایسی تربیت ہوئی کہ گو زمانے نے دیوان زندگی کے کئی ورق اُلٹ دیئے، مگر شعر کی گرمی اب بھی دلوں کو گرماتی ہے۔

مگر زمانے نے ایک اور کروٹ لی ہے۔ زندگی کی قدور بدل رہی ہیں، نظامِ معاشرت یکسر دوسرے نہج پر چل رہا ہے، زبان نئے خیالات اور نئے اسلوب سے مانوس ہو رہی ہے اور ادب کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ان بدلتے ہوئے حالات میں گرد و پیش کا صحیح جائزہ لے کر زبان کے ماضی اور مستقبل کو ہم آہنگ بنانے کی ضرورت تھی۔ اس خیال کے پیشِ نظر رامپور میں بزمِ سخن کا قیام عمل میں آیا، جو اس بڑے کام میں رام پور کے خوش ذوق ادیبوں کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

بزم نے پہلا عملی قدم اٹھایا اور یہ طے کیا کہ ملک کے مشہور شعراء کو دو دو تین تین کر کے رام پور میں دعوت دیجائے کہ وہ یہاں تشریف لاکر بزم کے جلسے میں اپنا منتخب کلام سنائیں، اور آخر میں ایک مجموعہ شائع کیا جائے، جس میں ہر شاعر کا منتخب کلام تصویرِ سوانح اور تحریر کا عکس شامل ہو۔ اس طرح سے اس مرقع میں ہماری شستہ اور منجھی ہوئی زبان کے بہترین اور مختلف النوع



اراکین بزم سخن - داھنے سے بائیں طرف

چودھری اکبر علی صاحب - ایم - اے - کولمبیہ سکرریٹری تعلیمات - عالمربیت خان بہادر ضمیر احمد ہاشمی بہادر -
 ایم - اے - بی - سی - ایس - ڈپٹی ریویو مینسٹر رام پور منہند بزم سخن - عالمربیت کر نل سید بشیر حسین زیدی بہادر سی - آئی - ای -
 بی - اے - کنشپ بارایش لا - چیف مینسٹر رام پور صدر بزم سخن - عالمربیت صاحبزادہ عبدالجلیل خان بہادر - بی - اے - (علیگہ)
 بی - سی - ایس - ہوم مینسٹر رام پور - عالمربیت جسٹس عین الدین انصاری بہادر - بی - اے - (کنشپ) بارایش لا -

ز

نمونے غزل اور نظم کی شکل میں پیش ہو سکیں گے۔ شعراء کو اصول شاعری میں ایک دوسرے سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مجموعی طور پر ہر پنج کا با کمال زبان کی خدمت کرتا ہے۔ ایک کے حصے میں لفظوں کا پرکھنا، روز مرہ کی صفائی بندش کی چستی اور سلاست آتی ہے، تو دوسرے لفظوں، نئی ترکیبوں اور نئے خیالات کاٹ چھانٹ کر زمین ہوار کرتا ہے، اور زبان کے لیے نئی راہیں نکالتا ہے۔ یہ دونوں مل کر اس کام کو کریں گے، تو ہماری زبان کے پھیلاؤ کے ساتھ اس کی ادبی گہرائی بھی قائم رہے گی۔

چنانچہ دورِ حاضر کے مشہور شعراء میں سے منتخب حضرات کو دعوت نامے روانہ کیے گئے۔ چند اصحاب بخوشی تیار ہو گئے، کچھ نے شرائط منظور کرائیں اور بعض نے سعادت مندی کا ثبوت طلب کیا۔ یہ طبقہ شعراء بھی کس قدر مختلف النوع ہے! بہر حال فی الجملہ سب نے کمالِ عنایت و کرم کا اظہار کیا۔ اپنا وقت صرف کیا، سفر کی تکالیف برداشت کیں اور ہم کو نہ صرف اپنی تشریف آوری سے بلکہ اپنا کلام سُنا کر احسان مند بنایا۔ یہ سلسلہ کم و بیش دو برس جاری رہا اور وقتاً فوقتاً رام پور میں مساعری ہوتے رہے۔

حضراتِ شعراء سے ہماری استدعا یہ تھی کہ وہ اپنے منتخب کلام، حالاتِ زندگی، تصویر اور تحریر کے نمونے کے ساتھ حسب ذیل سوالوں کے جواب قبلِ تشریف آوری روانہ فرمادیں:-

۱) شاعر کے نزدیک شاعری کا کونسا پہلو اہم ہے و اقتضای

مباشرتی یا روحانی ؟

(۲) شاعر کی نظر میں ہندی سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کا شمول
کس حد تک مناسب ہے؟

(۳) شاعر کی نظر میں اُردو ادب کی خدمت کس پہنچ سے ہونا
چاہیے ؟

(۴) شعر کے لیے ردیف، قافیہ کی پابندی کہاں تک ضروری ہے؟
(۵) (شاعر کے وردِ زبان) کسی دوسرے شاعر کے چند منتخب اور
پسندیدہ اشعار۔

(۶) نظم اور غزل میں کس کو بہتر استاد مانتے ہیں۔ (مقدمین،
متوسطین و متاخرین شعراء میں سے) ؟

کچھ اصحاب نے اس استدعا کی پذیرائی میں دلچسپی کا اظہار کیا، بیشتر
نے رام پور آنے پر ان امور کی تکمیل کی، اور دو چار نے تھوڑی سی
تکمیل کے لیے مہینوں کا انتظار کرایا۔ ایک دو حضرات نے اپنے کلام کے
خود انتخاب کرنے کو دشوار بتایا۔ آخر اُن کی رہنمائی سے یہ مرحلہ طے
ہوا۔ باوجود کوشش، چند حضرات خود رام پور تشریف نہ لاسکے۔ خان بہاؤ
رضاعلی وحشت (لکھنؤ) و نواب جعفر علی خاں آثر (کاشمیر) کو اپنی خواہش
کے باوجود موقع نہ ملا کہ تشریف لائیں، حضرات صفی (لکھنؤ) اور سائل
(دہلی) اپنی علالت کے باعث سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے
لیے تیار نہ ہوئے اور حضرت جلیل نواب فصاحت جنگ حیدر آباد
کے طویل سفر سے اجتناب کر گئے۔ ممکن تھا کہ ہم اور انتظار کر سکتے
تو کبھی نہ کبھی یہ اصحاب بھی تشریف فرما ہو جاتے؛ لیکن یہاں جلدی

تھی اور اس طرح سلسلہ ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔
جو اصحاب یہاں تشریف لائے تھے اُن میں سے ساحر دہلوی اور
آزاد انصاری انتقال کر چکے ہیں۔ ایک منتخب صحبت میں ساحر آنجنابی
کھڑے ہوئے ایک غزل پڑھ رہے تھے۔ دراز قد، لمبی سفید داڑھی
اور روشن چہرہ حاضرین کو متاثر کر رہا تھا کہ وہ اس شعر پر پہنچے۔
کوئی حرم سے، دیر سے منسوب ہو کوئی اک رہ گیا ہوں میں کہ تھکرا کہیں
مصرع ثانی شروع ہوا، تو اُن کی نگاہیں اوپر کو اٹھ گئیں، آنکھوں
میں دفعتاً چمک آگئی اور کچھ غم ہو گئیں۔ کیا معلوم، مرحوم کی آنکھوں
نے کیا دیکھا۔ شاید اُن کی آنکھیں اُسی وقت حیرت وصال سے سیرگما
ہو گئی تھیں۔ اُن کے بیٹھنے کے بعد کافی دیر تک کمرے میں خاموشی
چھائی رہی اور کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ کوئی اور فرمایش کرے۔
تھوڑے عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ انتقال کر گئے۔ آزاد
انصاری مرحوم نے سخت سردی کے زمانے میں سفر کیا۔ دسمبر
کا مہینہ اُنھوں نے خود پسند کیا تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ لیکن
یہ خیال کبھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اس قدر جلد سب کو خدا حافظ
کہ جائیں گے۔ قافی مرحوم تشریف لانے سے قبل ہی ذاعی اجل
کو لبیک کہہ چکے تھے۔ افسوس کہ اُن کے متعلق کسی امر کا تسکین
نہ ہو سکے کے باعث اس مجموعے میں اُن کا منتخب کلام وغیرہ
شامل نہیں ہے۔

ایل رام پور میں شہر و سخن کی گرمی ابھی باقی ہے۔ چنانچہ
اس بزم کی جتنی صحبتیں منعقد ہوئیں، رام پور کے ارباب ذوق

ی

اُن کے کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی۔ لیکن ارکانِ بزم کی خوش قسمتی اور ترقی، علم و ادب کے لیے فالِ نیک اعلیٰ حضرت سرکارِ والا تبار و حضورِ علیا حضرت کی ان مشاعروں میں ذاتی دیکھی تھی۔ چنانچہ نہ صرف اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت نے قدیم رنجہ فرما کر متعدد شعراء کا کلام سُنا اور پسند فرمایا، بلکہ ہماری استدعا پر علیا حضرت نے ایک اُردو غزل اور اپنی تحریر کا نمونہ اور اعلیٰ حضرت نے ایک ہندی نظم جو امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں لکھی گئی ہے، عطا فرمائی۔ یہ ملوکانہ کلام بھی بصد تشکر اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

موجودہ جنگ کی ہولناکیوں کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر چھایا ہوا ہے۔ ہر چیز گراں نہیں کیا ہو گئی ہے۔ شدید خواہش تھی کہ اس مجموعے کو آراستہ و پیراستہ کر کے دیدہ زیب مرقع کی شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ کاغذ وغیرہ کی گرانی حوصلے کو پست نہ کر سکی تھی، لیکن ہشیاء کی کمیابی نے مجبور کر دیا۔ بہر حال ایسے حالات میں جو کچھ بن سکا، پیش کیا جاتا ہے۔

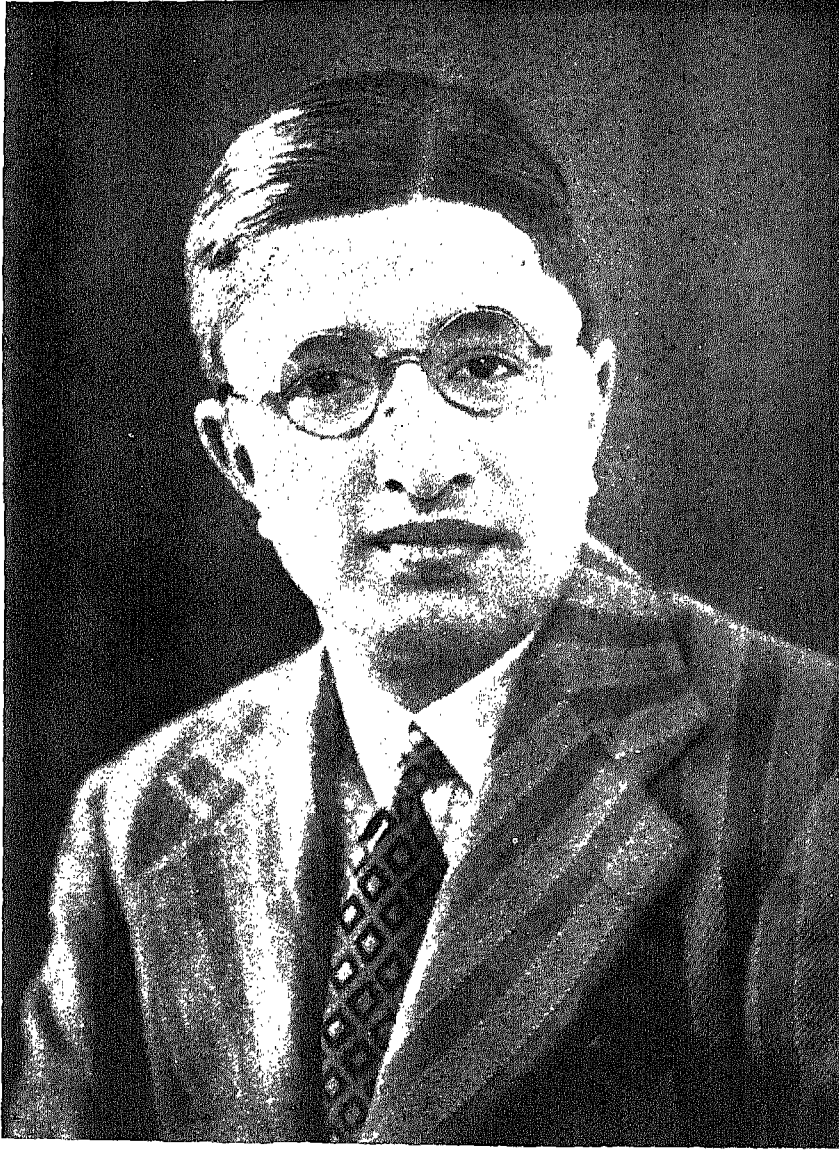
زیرِ نظر مجموعے کی تالیف میں متعدد احباب کی مدد لازماً امر تھا۔ چنانچہ اراکینِ بزمِ سخن کے علاوہ بہت سے اصحاب نے صرف اپنا وقت ہی صرف کیا، بلکہ دام و درم سے بھی بزم کی معافی کی۔ اگر ان سب کے نام درج کیے جائیں، تو ایک طویل فہرست ہو جائے گی۔ اس لیے تمام معاونین کا شکریہ سبائے فرداً فرداً

ۛ

کرنے کے یکجائی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اراکین بزم میں سے خصوصی
 ذکر کے قابل وڈ اصحاب ہیں، عالی مرتبت سید بشیر حسین زیدی صاحب
 بہادر چیف منسٹر جو شعراء کو دعوت دینے کے خیال کے بانی مبنی
 تھے اور جن کی وجہ سے اس سلسلے کے تمام لازمی انتظامات سہا
 کی جانب سے بغیر تردد انہرام پاتے۔ اور دوسرے میرے مرحوم
 دوست چودھری اکبر علی جو کئی ماہ کی سخت بیماری کا سامنا
 کرنے کے بعد ہم سب کو خیر باد کہ گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت
 عطا فرمائے۔ مرحوم نے شروع دن سے نہایت انہماک کے ساتھ
 جملہ امور میں ہاتھ بٹایا تھا۔ ان کے علاوہ امتیاز علی خاں صاحب
 عرشی کا ذکر نہ کرنا خلاف احسان مندی ہوگا۔ رامپور میں کوئی تصنیف
 یا تالیف کیوں نہ ہو، ان کی مرہونِ منت ضرور ہوتی ہو۔ چنانچہ
 اس مجموعے کی اشاعت بھی ان کی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔

ضمیر ہاشمی

سکرٹریٹ رامپور
 ۶ اکتوبر ۱۹۴۴ء



میجر مہزائیس عالیجاہ فرزند دلپذیر دولت انگلیشیہ مخلص الدولہ ناصر الملک
امرا الامراء / نواب ڈاکٹر سر سید محمد رضا علیخان بہادر / مستعد جنگ
جی سی آئی ای - کے سی ایس آئی - ڈی لٹ - ایل ایل ڈی
فرمانروائے دہلی پور

عَظِيمَةٌ

ہندگان ہمایون اعلیٰ حضرت فرمائو اسے رامپودم اقبایہم ملکہم

مجر

بتقریبین ولادت جناب سید علیہ السلام
راگائین کلیان

روپ نزلے تمہارے علی جی
سنا

ہو گن گیانی۔ جگت ہے تمہارے علی جی

انتر انتر

بیچ بھنور جب نور کی تیا۔ آن بھنسی تھی۔ تمہیں تھے کھبون ہارے علی جی

انتر انتر

سلیمان جی بھی سنگھ کے گھ سے۔ پاکیو گتی۔ جھے میں جو تم کو پکارے علی جی

انتر انتر

پر تھوی راجا بنے سلیمان۔ دیکھ انگو تھی۔ تام پہ تھرے من ہارے علی جی

انتر انتر

جیون دے کے پران لیو تم کنتو نصیری۔ تمہیں کو رام پکارے علی جی

انتر انتر

کرشن کوؤ بھگوان کہت ہے۔ کوؤ مراری۔ نام اینک تمہارے علی جی

انتر انتر

عیسیٰ جنم ہیری مریم نکلیں۔ بے بے تھری۔ ایشور بھون میں پدھارے علی جی

انتر انتر

رہا کے من میں ہے پرکاشیت۔ جیوتی تھری۔ نبی کے نبین اجیارے علی جی

عکس تحریر علیا حضرت ہر ہائٹس دام اقبالہا

غزل

ایسے بیمار کی دوا کیا ہے جو بتاتا نہیں ہو کیا ہے
کون رشتا ہے اس زمانے میں کس کے لیے نہ التجا کیا ہے
لب بیمار تہر تہراتے ہیں جلد کے نیچے ذرا دعا کیا ہے
بھٹکے جو دیکھتا ہے روتا ہے کوئی کیا جانے ماجر کیا ہے
حضرت خفیر بن بنائے زندگی کا مدعا کیا ہے
درد پر دوسروں کے نہیں دینا یہ بن اچھا ہے تو برا کیا ہے

فخر خاتون ہند ہے مسیت
ہم سے پوچھے کوئی دعا کیا ہے

دعا
"فخر خاتون ہند"

1000

1000

عطیہ

علیٰ حضرت ہر آنس دام اقبالہا

ایسے پیار کی دوا کیا ہے جو بتا تا نہیں ہو کیا ہے
کون سنتا ہے اس زمانے میں کس سے کہیے کہ التجا کیا ہے
مجھ کو جو دیکھتا ہے، روتا ہے کوئی کیا جانے، ماجر کیا ہے
حضرت خضر بھی بتا نہ سکے زندگانی کا مدعا کیا ہے

درد پر دوسروں کے ہنس دینا

یہ بھی اچھا ہے، تو بُرا کیا ہے

آرزو لکھنوی

۲ مئی ۱۹۴۱ء



آرزو لکهنوی

غزل

رہ رضا کی فضا زندگی بڑھاتی ہے قدم قدم پہ یہ سہا سہاں بن کے آتی ہے
 جھانکے سجت پہ نقشہ مجھے دکھاتی ہے یہ تار تار حیرانی کو روٹھی جاتی ہے
 نظر نواز ہے دن کر بھی نشانِ بقیعِ ناز زمین ٹوٹے ستاروں سے جھجھکتی ہے
 نہ مابین کون سے نقشے کو پہنچا دے اجاڑ اجاڑ کے دریا بانی جاتی ہے
 یہ التفات کی کما فراد اعدا کی شاہ جو خون کرتی نہیں خود کشی سکھاتی ہے

نامہ سید از حبیب آزاد
 سنہ ۱۳۱۶
 میر تقی میر
 میر تقی میر
 رام پور

آرزو لکھنوی

سرگزشت

سید انوار حسین نام، منجمو صاحب عرف، اور آرزو تخلص ہے۔
والد کا نام میر ذاکر حسین یاس، اور سال ولادت ۱۲۸۹ ہجری ہے۔
ان کے مورث اعلیٰ عالمگیر کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آکر
فوج میں ملازم ہوئے، اور اجمیر (راجپوتانہ) میں قیام کیا۔ پھر لکھنؤ
چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔
حضرت آرزو کا درمیانی قد، آفتابی چہرہ اور گندمی رنگ ہے۔
کشادہ پیشانی سے متانت، سنجیدگی اور فراخ حوصلگی کا پتا چلتا ہے۔
تواضع، انکسار، اور خلوص ان کے نمایاں خصوصیات ہیں۔
ذوق شاعری فطری ہے اور بہت کم عمری سے شعر کہتے ہیں۔
ان کے والد کو اس شوق کا پتا چلا، تو ہمراہ لے جا کر حضرت جلال
لکھنوی کا شاگرد کرا دیا۔ اُس وقت ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔ رفتہ
رفتہ مشق سخن اس درجہ بڑھی کہ جلال اپنے دوسرے شاگردوں
کی غزلیں اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔
تصانیف میں تین دیوان حسب ذیل ناموں سے طبع ہو چکے ہیں:-

(۱) فغانِ آرزو۔ اس میں ۱۵ سال سے ۲۵ سال تک کی عمر کا کلام ہے۔

(۲) جانِ آرزو۔ اس میں ۳۵ سال کی عمر کے بعد کا کلام ہے۔

(۳) سُریلی بانسری۔ اس میں تیسرے دور کا کلام جمع کیا ہے، اور یہ خصوصیت ہے کہ اشعار میں عربی یا فارسی لفظ بالکل استعمال نہیں ہوئے ہیں۔

عرصے تک کلکتے میں سکونت رہی۔ آج کل بیٹی میں مقیم ہیں۔

انتخابِ کلام

معصومِ نظر کا بھولا پن، لپا کے بُھانا کیا جانے
 دل آپ نشانہ بنتا ہے، وہ تیر چلا نا کیا جانے
 کہ جاتی ہے وہ چینِ جبین، یہ آج سمجھ سکتے ہیں کہیں
 کچھ سیکھا ہوا تو کام نہیں، دل ناز اٹھانا کیا جانے
 چٹکی جو کھلی، کوئل کو کی، اُفت کی کہانی ختم ہوتی
 کیا کس نے کہا، کیا کس نے سنی، یہ بات زمانہ کیا جانے
 تھا دیروصر میں کیا رکھا، جس سمت گیا ٹکرا کے پھرا
 کس پردے کے پیچھے ہے شعلہ، اندھا پروانہ کیا جانے
 یہ زور ازوری عشق کی تھی، فطرت ہی جس نے بدل ڈالی
 جلتا ہوا دل، ہو کر پانی، آنسو بنجا نا کیا جانے
 سجدوں سے پڑا پتھر میں گرٹھا، لیکن نہ مٹا ماتھے کا ککھا
 کرنے کو غریب نے کیا نہ کیا، تقدیر بنا نا کیا جانے
 آنکھوں کی اندھی خود غرضی، کاہے کو سمجھنے دیگی کبھی
 جو نیند اُڑا دے راتوں کی، وہ خواب میں آنا کیا جانے
 جس مالے سے دنیا بیکل ہے، یہ جلتے دل کی شعل ہے
 جو پہلا لو کا خود نہ ہے، وہ آگ لگانا کیا جانے

ہم آرزو آسے بیٹھے ہیں، اور وہ شہنائے بیٹھے ہیں

مشتاق نظر گستاخ نہیں، پردہ سر کا نکلیا جانے

اے مرے زخمِ دل نواز، غم کو خوشی بنائے جا

آنکھوں سے خوں بہائے جا، ہونٹوں سے مسکرائے جا

سانس کا تار ٹوٹ جائے، ٹوٹے نہ تارِ آہ کا

ایک ہی تے یہ گالے جا، ایک ہی دھن بجائے جا

حکمِ طلب کے منتظر، شوق کی آبرو نہ کھو

سر کو قدم بنا کے چل، آنکھوں سے مے پلائے جا

مے وہ دوائے تلخ ہے، جس کا اثر ہے خوشگوار

پیتے ہی سُنھ بنائے جا، دل میں مزے اڑائے جا

منزلِ بچہ دی شوقِ حدِ نظر سے دور ہے

پیچھے پلٹ کے بھی نہ دیکھ لگے قدم بڑھائے جا

اک ہمت ہے پائے ناز، اک ہمت ہے سرِ نیاز

یہ نوچلین جہاں کا ہے، جتنا دبت دبتائے جا

آرزو، اُس سے کمد و صاف، غم کا اثر ہی دیر پا

جسٹہ نہیں نہ آئے گی اور بھی گدگدائے جا

دن میں سوزِ نگ سوگو با و صبا آئے گئی نہ مگر میری تباہی کی ہوا آئے گئی

اثرِ نالہ مبارک کہ وہ غافل یہ کہے دل ہلاتی ہوئی کسکی یہ صدا آئے گئی

تھا محبت بھری اک سانس کا وقفہ کتنا اتنی ہی دیر میں سو بار حیا آئے گئی

بس ہیں تک ہفتی رہ نامہ پیغام کی حد
ہر نفس گردش نیزنگ کا محور ہے بنا
احذر خوگیر ایذا کا زوال لغت
کیا بنا دیگا نہ جانے تجھے بڑھنا ہو احسن
نہ حیا جگہ پھر آئی، نہ ہو آ کے گئی
وہ پلٹ کر نہ پھر آئی، جو قصا آ کے گئی
بن گئی جان پہ، جب کوئی بلا آ کے گئی
ناز سکھاتی گئی، جو بھی ادا آ کے گئی

آرزو، مستی، شب، بنکے رہا دن کا خار
جھومتی جب کوئی متوالی گھٹا آ کے گئی

یہ داستانِ دل ہو، کیا ہوا دازباں سے
ہے ربط و دلول کو بے ربطی بیاں سے
یہ روتے روتے ہنسنا ترتیبِ کریم ہے
میدانِ امتحان میں ہر بغیرِ محبت
اس طولِ خاموشی کا زور بیاں بھی نکھا
ہی جذبِ شوقِ منزل، منوںِ غیر کیوں ہو
جب حسنِ خود نما ہو، اور شوقِ رخسارِ فلک
حاصل تو زندگی کا ہفتی زندگی میں کی
ہر کام پر ٹھکنا، ہر بار رو کے ٹکنا
آنکھوں سے باغبان کے شعلے نکل رہے ہیں
تینکے دبائے منہ میں نکلا ہوں آشیاں سے

دل کا سکون گنوا کر ہوں، آرزو، پشیاں

کچھ لے کے رکھ نہ چھوڑا کیوں جنسِ ایچاں سے

دل لذتِ غم کی نعمت پر، بجا نہیں جتنا ناز کرے
مل جائے تو، اونہنے والے، تو مجھ سے زیادہ ناز کرے

تاروں پہ فلک، پھولوں پہ چمن، ذروں پہ سحر ناز کرے
کچھ اس سے الگ، امیٰ محسنِ عطا، دل جس پہ ہمارا ناز کرے
پستی پہ بھی ہے اتنی اونچی، ناکامِ محبت کی منزل
بہود کچھ کے جس کو آپ نخل، اور سارا زمانہ ناز کرے

حدو نہ گزر، سیلاب نہ بن، چکر میں نہ پھنس، گرداب نہ بن
بن ہلکی موج، مگر ایسی جس موج پہ دریا ناز کرے
باز بچہ اُلفت میں دل کی کیا لٹی سیدھی چالیں ہیں
بھوجینے والا شرمندہ اور ہارنے والا ناز کرے

قرباں گہ اُلفت میں آ کر، اتنی تو دکھا دے پامردی
قتال نگاہیں جھک جائیں، خوں گشتہ تمنا ناز کرے
یہ معرکہ اُلفت وہ ہی، مجز فتح شکست نہیں اس میں

جیتا جو بچے خود فخر کرے، مر جائے تو دنیا ناز کرے
تو آرزو، اپنی ہستی کو پائندِ نیاز ہی رہنے دے
ہر طرف کا ہے اک پیمانہ، جو چاہے جتنا ناز کرے

مقید نور جہاں

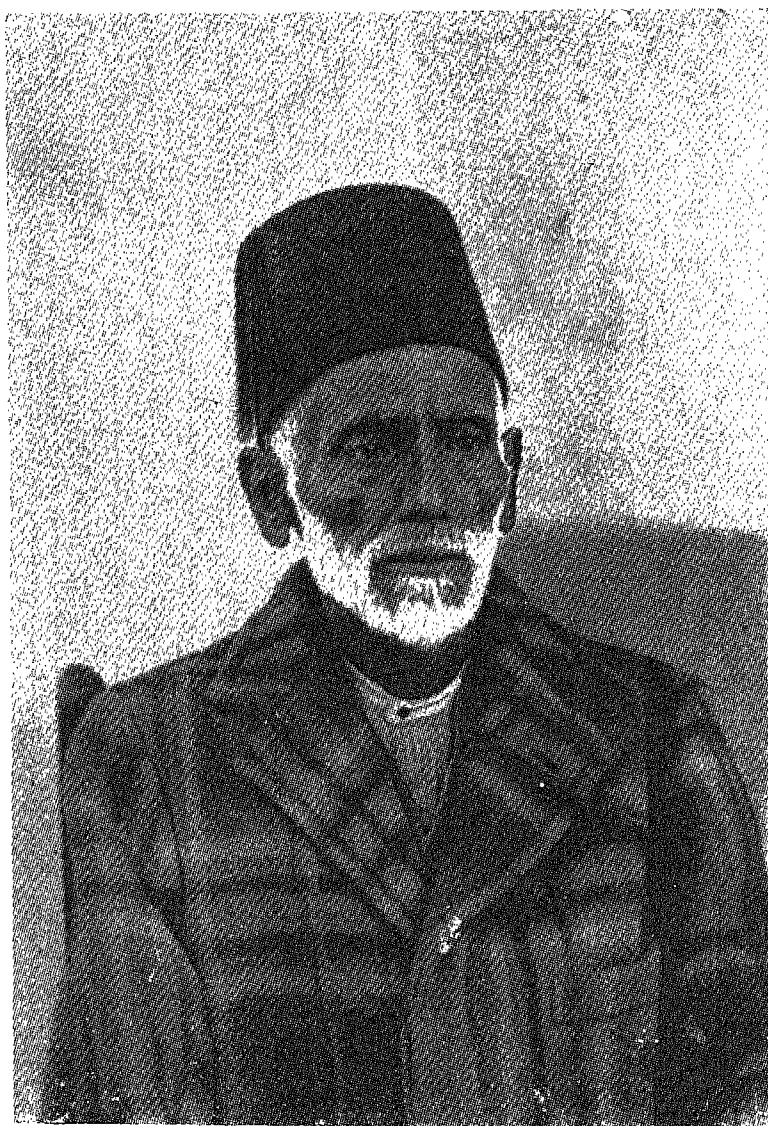
آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا تو کوئی نہیں
 سب دوست ہیں اپنے مطلب کے، دُنیا میں کسی کا کوئی نہیں
 جو باغ تھا کل پھولوں سے بھرا، اٹھکیلیوں سے چلتی تھی ہوا
 اب سنبل و گل کا ذکر تو کیا، خاک اُڑتی ہو، اُس کا کوئی نہیں
 بیٹھے ہیں کہاں اہلِ مسند، آغاز وہ نیک، انجام یہ بد!
 یا بزمِ طرب، یا گنجِ حید، یا وہ مجمع، یا کوئی نہیں
 کل جن کو اندھیرے سے تھا حذر، رہتا تھا پراغاں شیشِ نظر
 اک شمع جلا دے تربت پر، جُرداغ، اب اتنا کوئی نہیں
 قتالِ جہاں معشوق جو تھے، سونے ہیں پڑے مرقد اُن کے
 یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں
 اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
 رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی
 قید کو توڑ کے نکلا جب میں، اٹھکے بگولے ساتھ ہوئے
 دُشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی
 لاگ میں حُسن و عشق کی اکثر چھیر اُدھر سے ہوتی ہے
 شمع کا شعلہ جب لہرایا، اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہ جنوں ہیں، بستی کیسا دیرانہ کیا
 اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا، دوڑ پڑا دیوانہ بھی
 غنچے چُپ ہیں، گل میں ہوا پر، کس سے کیسے دل کمال
 خاک نشیں اک سبزہ ہے، اپنا بھی بیگانہ بھی
 ایک لگی کے دو ہیں اثر، اور دونوں حیرتیں ہیں
 نو چو لگائے شمع پڑی ہے، رقص میں ہے پردانہ بھی
 دویر مسرت، آرزو، اپنا کیسا زلزلہ آگیا تھا
 ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی
 سچ بھی بُرا وہ جس کو سُن کر لوگ کہیں تو جھوٹا ہے
 جس کا لٹا یا سب نے پایا، محکوم اُسی نے لُٹا ہے
 تارہ ٹوٹا، دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
 کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا، کس کا سہارا لُٹا ہے
 پتہ کیسا، بوٹا کیسا، جڑ تو ایک ہے دونوں کی
 کہنے کو ہم بھی کہہ دیتے ہیں، یہ پتہ ہی، یہ بوٹا ہے
 الگ رہے جیتے جی سدا جو، وہ رو رہے تھے لپٹ لپٹ کے
 گھڑی گھڑی پھرتی پٹلیوں نے سماں یہ دیکھا پلٹ پلٹ کے
 جو آنسو آنکھوں میں آچکے ہیں، کہاں وہ جائیں گے اب پلٹ کے
 یہ چڑھتے پانی کے ہیں تھپیڑے، پڑیں گے مٹھ پر اُلٹ اُلٹ کے

کٹا رختون لیے کھڑی تھی، کرید کرنے کو میرے جی کے
 لہو تھا جتنا بھی ڈیل بھر میں، سب اک جگہ آگیا سمٹ کے
 بھنور سے نکلی جو ناؤ بچ کر، تو پار اترنے میں کھائی مٹھو کر
 بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جس پر، وہی کگا راگر اچھٹ کے
 جو مار رکھا ہے تم نے جی کو، نہ آرزو اب مہنے دینا
 ہوئی جو مٹھی ذرا بھی ڈھیلی، یہ سانپ کاٹے گا پھر پٹ کے

آزاد انصاری

۲۲ نومبر ۱۹۴۱ء



آزاد انصاری

ترے لئے خبر کو بہ پیام خبر ہے ۔ کہ تو متدا اور عالم خبر ہے

اگر آزاد سادہ پیش لفظوں میں نہیں جیتا ۔ - تو جا اور جائے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

زبان شکوہ محرومی دیدار آنا تھا ۔ - خطاب آیا کہ جا اور لقاقت دیدار پیدا کر
تجھے آزاد ! بول در پیش مال کوں مانگے گا ۔ - جہاں سے ہو، جہاں سے ہو، در سنا پیدا کر

بہت کافر اب یہ واضح ہو، خدا بھی اپنے بند ویر ۔ - فقط ظلم و ستم رکھے خدا کی نہیں سکتا
ازل سے جو شریعت اللہ مشرب کیلئے آتا ہے ۔ - اب تک وہ گناہ پر سالی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد اب بے خوف سر برم نظم ہے
وہاں روح القدس بھی لب نشانی کر نہیں سکتا

خاسار الخائف احمد آزاد انصاری سہارن پوری بقم خود

رام پور (ریاست) ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء

آزاد انصاری

سمرگزشت

الطاف احمد نام ، ابوالاحسان کنیت ، اور آزاد تخلص ہے۔ نسلاً انصاری ، اور سہارنپور کے باشندے ہیں۔

ناگپور میں ، جہاں ان کے والد اور سیر تھے ، ۲۷ رجب ۱۲۸۵ء کو ان کی ولادت ہوئی ، اور نظیر حسین تاریخی نام رکھا گیا۔ سات سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ، نونانا کی پرورش میں آگئے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر کے ، مولوی عبداللہ انصاری سے گلاوٹی میں فارسی ، اور مولوی صدیق علی سے مالیر کوٹیلے میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں نانا کا انتقال ہو گیا ، اور یہ سہارنپور چلے آئے۔ یہاں آکر حافظ نیاز علی یریلوی سے فارسی کی اور مولوی بشیر احمد علیگڑھی سے عربی کی تکمیل کی۔ ابھی ۱۸ ، ۱۹ سال کی عمر تھی کہ شادی ہو گئی ، اور مزید تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد معاشی ضروریات کے تحت حکیم نور احمد سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خاں لکھنوی سے طب پڑھی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک طبابت ہی

ریجہ معاش رہا۔ اس کے بعد حیدر آباد جا کر عینک فروشی اختیار
کی، جو اب تک جاری ہے۔

آزاد، اوسط قد، گندمی رنگ، پھریے جسم اور موزوں خد
و خال کے شاعر ہیں۔ گرم و سرد زمانہ کا پورا تجربہ رکھتے ہیں، اور
شائستگی، ممانت، خوش اخلاقی، پختگی وضع اور پرانی تہذیب کے
آئینہ دار ہیں۔

شعر گوئی کا شوق ۱۳، ۱۴ سال کی عمر سے تھا۔ لیکن مہل
ہونے کے ڈر سے نہ کسی کو شعر سناتے اور نہ کسی مشاعرے میں
پڑھتے۔ بالآخر مشاعرے میں مولانا حبیب الرحمن بیدل (شاگرد حضرت
غالب) سے تلمذ اختیار کیا، اور عطار و تخلص سے غزلیں کہہ کر
مشاعروں میں پڑھنے اور رسائل میں طبع کرانے لگے۔

شعر گوئی کے ابتدائی دور میں استاد ذوق کے اتباع کی
کوشش کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد داغ، امیر، جلال وغیرہ
اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا، تو ان حضرات کے رنگ پر طبع
آزمائی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس سے بھی دل سیر ہو گیا، اور
طبیعت کو کسی اور شاہراہ کی تلاش ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ
ان کے استاد (بیدل) حیدر آباد کے دار العلوم میں ملازم ہو کر
جا چکے تھے، اور شمالی ہندوستان میں علامہ حالی کا کلام اپنی
مقبولیت کا سکہ چلا رہا تھا۔ اس بے خضریٰ کے زمانے میں
آزاد نے ان کا مجموعہ کلام پڑھا، اور اس سے اس قدر متاثر
ہوئے کہ پچھلا سارا ذخیرہ نذر آتش کر دیا۔ سابق تخلص عطا

کو خیر باد کہہ کر آزاد تخلص اختیار کیا، اور سہارنپور سے پانی پت جا کر حضرت حاکی کے شاگرد ہو گئے۔ چنانچہ موصوف سے اصلاح لینے کا سلسلہ ان کی سلسلہء میں وفات تک برابر جاری رہا۔ حضرت آزاد اُردو زبان کے اندر ہندی اور سنسکرت کے صرف انھیں ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال روا رکھتے ہیں، جن میں آسانی کے ساتھ زبان میں کھپ جانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے، اور ان بکرا جیتی الفاظ کے سخت مخالف ہیں، جن کے رواج دینے کی آج کل جد و جہد کی جا رہی ہے۔

زبان کے لیے مضمون کو پامال کرنا اور مضمون کے لیے زبان کا خون کرنا کسی حد تک مناسب نہیں سمجھتے۔

نظم میں میر انیس، حاکی اور اقبال کو، اور غزل میں غالب، مومن، مصطفیٰ اور میر تقی کو استاد مانتے ہیں۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں :-

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہر بات ہی کچھ اور حالی

عالم میں تجھ سے اور سہی، تو مگر کہاں

جوانی اور بوے گل میں، یارب! کیا تعلق تھا لا آعلم

کہ بوے گل کے آتے ہی جوانی یاد آتی ہے

رنج سے خوگر ہوا انسان، تو مٹ جاتا ہر رنج غالب

مشکلیں انہی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوئیں

- ذوق اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے
- مجرع شبِ فرقت تو بسر ہو، یارب!
صبح کو روزِ قیامت ہی سہی
- اقبال وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کر گسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی
- جنابِ آزاد نے معارفِ جمیل میں لکھا ہے کہ حسبِ ذیل خصوصیات
اُن کے اپنے کلام میں بکثرت و بالتزام ہیں:-
- (۱) الفاظ کی ترتیب -
- (۲) سلاست و صفائی زبان -
- (۳) ندرتِ بیان -
- (۴) تکرارِ الفاظِ حسین -
- (۵) صنعتِ ترصیع و تقابل -
- (۶) صنعتِ ترصیعِ جدید کی ایجاد -
- (۷) اصطلاحاتِ علمیہ کا استعمال -
- معلوم ہوا کہ آخر ۱۹۴۲ء میں حضرت آزاد کا انتقال ہو گیا۔

انتخابِ کلام شکریہ سرکار

لائی ہے قدر دانی اصحابِ قرداں
آیا ہوں حسبِ دعوتِ سرکارِ رام پور
سمجھا مجھے بھی لائقِ لطف و عطا و خاص
شکریہ عنایتِ سرکارِ رام پور

مہرِ تابانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے شکر، مجھ پہ بھی چمکا
ابرِ بارانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے شکر، مجھ پہ بھی برسا
زیرِ دامانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے شکر، میں بھی آ پہنچا
عالمِ شانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے شکر، میں بھی دیکھ سکا
لطف و احسانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے، مجھ پہ بھی ہوا نازل
دعوتِ خوانِ رام پور اسٹیٹ	شکر ہے میرے بھی نصیب میں تھی

کیوں نہ قسمت پہ اپنی ناکروں
کہ ہوں مہمانِ رام پور اسٹیٹ

حق بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا
جو بنانا ہو بنا، لیکن کسی قابل بنا
شوق کے لائق بنا، ارمان کے قابل بنا
اہلِ دل بننے کی حسرت ہی، تو دل کو دل بنا

فقہہ تو بیشک کھلا، لیکن بہ صد وقت کھلا
 کام تو بے شک بنا، لیکن بہ صد شکل بنا
 جب ابھارا ہی، تو اپنے قرب کی حد تک بھا
 جب بنایا ہی، تو اپنے لطف کے قابل بنا
 سب جہانوں سے جدا اپنا جہاں تخلیق کر
 سب مکانوں سے جدا اپنا مکانِ دل بنا
 پھر نئے سرے جنوں قیس کی بُنیاد رکھ
 پھر نئی سیلابنا، ناقہ بنا، محل بنا

یہ تو سمجھے، آج آزاد ایک کامل فرد ہو
 یہ نہ سمجھے، ایک ناقص کس طرح کامل بنا

ایک کاش خبر موتی، تو دل سے بھلا دیگا	ایک کاش خبر موتی، تو دل سے بھلا دیگا
اک روز ترا سودا ہر خطِ مٹا دے گا	اک روز ترا سودا ہر خطِ مٹا دے گا
تم جبر کیے جاؤ، ہم صبر کیے جائیں	اللہ تو منصف ہے، اللہ تو جزا دے گا
امید سکوں رخصت، تسکینِ روضِ خضرت	اب درو کی باری ہے، اب درو فرما دے گا
اک روز دل رہن خود راہ نما ہوگا	اک روز یہی دشمن منزل کا پتا دے گا
آزادِ گدا مشرب، دنیا سے غرض، مطلب	
کوئی ہمیں کیا دے گا، دے گا تو خدا دے گا	

نہ یہ سامان پیدا کر، نہ وہ سامان پیدا کر	یہ استقلال یکسو ہو کے اطمینان پیدا کر
نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر	جگر زخمی، دل آشفتنہ، نظر حیران پیدا کر

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دیگی جو الفت ہو، تو الفت کی نظر سے مطمئن فرما
 ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر جو دعویٰ ہو، تو دعویٰ پر کوئی برہان پیدا کر
 جفا میں بات پیدا کر، ستم میں شان پیدا کر
 مآلِ کارِ اظہارِ تمنا کیا گذارش ہو طبیعت طفر کرتی ہو کہ اور ارمان پیدا کر

اگر آزاد سادرویش نظروں میں نہیں چھپتا

تو جیا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

ستمِ دوست، فکرِ صداوت کہاں تک؟ کہاں تک فاسدِ بغاوت کہاں تک؟
 خلافِ سلوکِ محبت کے خوگر خلافِ سلوکِ محبت کہاں تک؟
 مسلسل ستم کی حکومت کے بانی مسلسل ستم کی حکومت کہاں تک؟
 اٹھو، درد کی جستجو کر کے دکھائیں تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک؟
 کبھی حکیم پیرِ مغان بھی بجا لا فقط اتباعِ شریعت کہاں تک؟

کبھی کچھ نتیجہ نکالو، تو حبانیں!

فقط خطِ معلولِ علت کہاں تک؟

نہ پوچھو، کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں

مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

ادھر پہلو سے تم اٹھو، اُدھر دُنیا سے ہم اٹھیں

چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ ہی بیکار بیٹھے ہیں

کسے فرصت کہ فرضِ خدمتِ اُلفت بجا لائے

نہ تم بیکار بیٹھے ہو، نہ ہم بیکار بیٹھے ہیں

اٹھتے ہیں، تو گرم جستجوے دوست اُٹھتے ہیں

جو بیٹھے ہیں، تو محو آرزوے یار بیٹھے ہیں

ام دستگیری ہے، کہ تیرے رہبر و الفت

ہزاروں جستجوئیں کر کے ہمت یار بیٹھے ہیں

بوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے؟ کچھ نہیں بابا

گدا ہیں اور زیر سایہ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے مینا نہ خالی ہو

وہ دیکھو، کون بیٹھا ہے؟ وہی سرکار بیٹھے ہیں

اک شانِ خدا ہو، میں نہیں ہوں وہی جلوہ نما ہے، میں نہیں ہوں

مانہ پہلے مجھ کو ڈھونڈتا ہے مگر تیرا پتا ہے، میں نہیں ہوں

یے ہوتے، میری ہستی کا کیا ذکر یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں

مدائے ”نَحْنُ اقْرَبُ“ کہہ رہی ہوں کہ تو مجھ سے جُدا ہے، میں نہیں ہوں

یہ خود تشریف فرما ہے جہاں ہیں تمہیں دھوکا ہوا ہے، میں نہیں ہوں

ماں میں اور کہاں خبطِ اَنَا الْحَقُّ کوئی میرے سوا ہے، میں نہیں ہوں

مجھے آزاد، دنیا کیوں نہ پوچھے

کسی کا نقشِ پا ہے، میں نہیں ہوں

تجدیدِ محبت کے ارمان

پھر تقاضائے نظر سلسلہ جنباں ہوگا پھر تماشاے بہارِ رخِ جاناں ہوگا

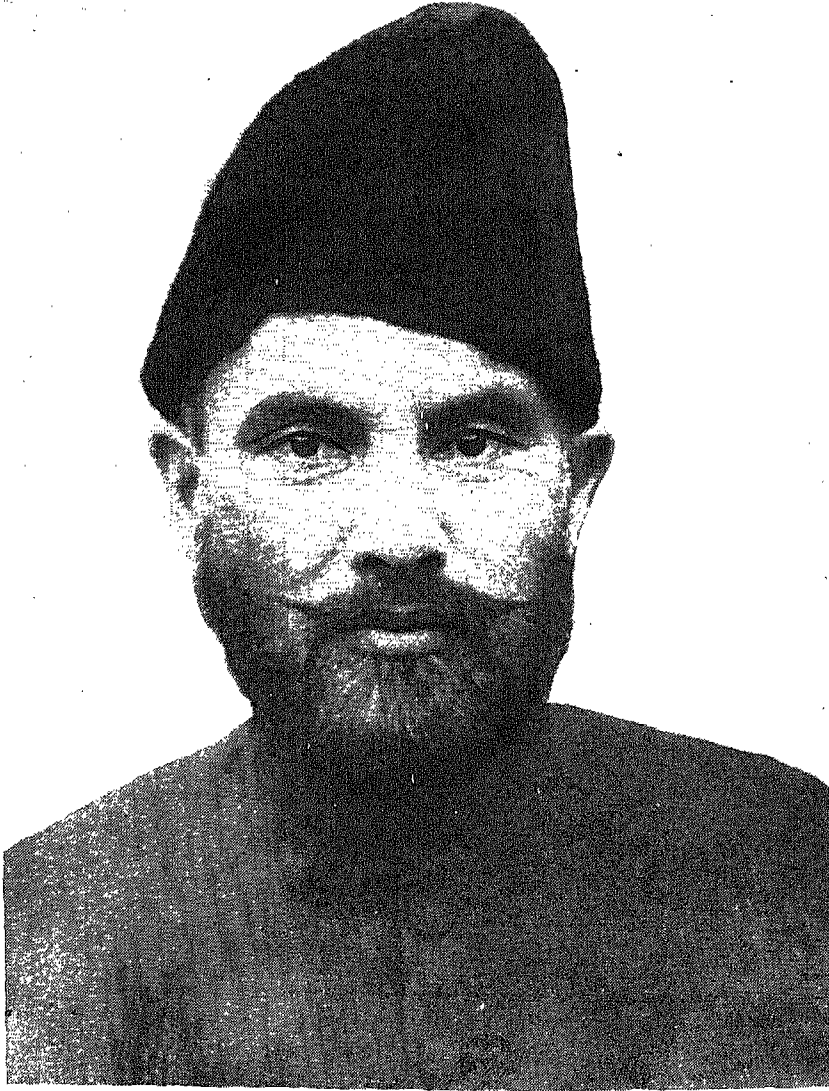
پھر سکوں عالمِ وحشت میں بدل جائیگا
 پھر نڈر عرصۃ الفت میں قدم رکھوں گا
 پھر وہی نغمہ دلِ دوڑ دفا چھڑوں گا
 پھر تعلق کا جنوں اور سوا ابھرے گا
 پھر نئے سرے سے محبت کے فرے آئیں گے
 پھر کوئی غیرت گلزارِ جہاں دل لیگا
 پھر گلستانِ محبت میں بہا ر آئے گی
 پھر تنائے خزیں سازِ طرب چھڑیگی
 پھر مراد کھ مجھے تسکین دوائے نختے گا
 پھر مری طبع مجھے کفر کی دعوت دیگی
 پھر امیدِ کرم یار میں خوش گزریگی
 پھر مجھے فکرِ دو عالم سے نجاتیں ہوں گی
 پھر جنوں گرم تقاضے بیاہاں ہوگا
 پھر وہی پاسے ثبات اور وہی سہاں ہوگا
 پھر وہی زخمہ، وہی تارِ رگ جاں ہوگا
 پھر تعلق میں غلو اور دو چنڈاں ہوگا
 پھر نیا سلسلہ حسرت و اراماں ہوگا
 پھر مقدرِ گلِ مقصود بہ دامان ہوگا
 پھر شبستانِ تنہا میں چراغاں ہوگا
 پھر دلِ غمزہ خوش ہو کے غرنخواں ہوگا
 پھر مراد در مجھے غیرت درماں ہوگا
 پھر مرا کفر مجھے دعوتِ ایساں ہوگا
 پھر علاجِ ستم گردش دوراں ہوگا
 پھر مجھے زلیست کا ہر مرحلہ آساں ہوگا

غلط، آزاد، ترے دل کے یہ شہات غلط

مطہن ہوں کہ مرے درد کا درماں ہوگا

اثر راپنوری

۲۰ فروری ۱۹۳۲ء



اثر رام پوری

عزل

وہ انکا حجاب اور نزاکت کے نظارے آئے وہ شبِ وعدہ تصور کے سہارے
 وہ سالی گھٹا اور وہ بڑھتے ہوئے دھارے نرا بد بھی اگر دیکھے تو ساقی کو پکارے
 وہ بیوہ گداز، وہ غمور نگاہیں اب کیا کہوں یہ لمحے کہاں میں نے گزارے
 خود حسن کا معیارِ مذاق نظر ہے اتنے ہی حسین آپ ہیں جتنے مجھے پیارے
 بے وجہ نہیں حسن کی تنویر میں تابش کو دیتے ہیں خاکِ سترِ الفت کے شہزادے
 تم چاہو تو دو لفظوں میں طے ہوتے ہیں جھگڑے کچھ شکوے ہیں بیمارے کچھ عذر تہارے

پھر جام بکف ہو گئی ہر چیزِ آخرِ آج
 یاد آگئے پھر مدد بھری آنکھوں کے اشارے

محمد علی خان اثر راپوری

محمد علی

۲۰ فروری ۱۹۴۲ء

اثر رامپوری

سرگزشت

محمد علی خاں نام، اثر تخلص، قوم پٹھان احمد زئی، سال ولادت ۱۸۹۲ء، سکونت رام پور، والد کا نام مولوی محمد شفیع خاں اور دادا کا نام شاہ نواز خاں ہے۔

قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، فارسی کی متداول درسی کتابیں مولوی عبدالرزاق خاں طالب سے پڑھیں، اور منشی فاضل کا امتحان مولوی سید اولاد حسین شاداں بلگرامی سے پڑھ کر پاس کیا، عربی میں زیادہ تر مولانا سلامت اللہ صاحب سے تلمذ رہا ہے۔

درمیانی قد، دھرا جسم، فراخ پیشانی، خوش قطع چہرہ اور سرخ و سپید رنگ ہے۔ اسلامی اخلاق اور شایستگی کا نمونہ، صوم و صلوة کے پابند اور اہل علم کے قدردان ہیں۔

ابتدائی مشق میں کسی سے مشورہ نہ بنیں تھا۔ ۱۹۳۵ء سے جہاں جلیل مائیکپوری کے پاس اپنا کلام بھیجنا شروع کیا، لیکن موصوف کی عدیم القریں کے باعث اصلاح میں تاخیر ہوتی تھی، اس لیے

۱۹۴۱ء میں حضرت آرزو لکھنوی کی خدمت میں چند غزلیں روانا کیں۔
 آج کل رام پور اسٹیٹ کونسل کے سپرنٹنڈنٹ آفس ہیں۔ ملازمت
 کی مشغولیت کے باعث مشقِ سخن کے لیے وقت نہیں ملتا، تاہم
 احباب کی فرمائشوں کو پورا کرتے ہیں، اور مقالے کی نظمیں لکھ کر
 وقتاً فوقتاً انعامات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

تالیفات میں نشر کی چند مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ایک مجموعہ
 ”وطن کے گیت“ طبع ہو چکا ہے۔

نظم میں میر انیس اور علامہ اقبال کو اور غزل میں میر
 غالب، جلیل اور آرزو کو استاد مانتے ہیں۔

ان کی رائے میں شاعری کا اہم پہلو محاکات اور واقعہ نگاری
 ہے۔ اردو شاعری میں غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے کے خلاف ہیں
 خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔

اشعار میں قافیہ و ردیف کی ضرورت کے قائل ہیں، اس لیے
 کہ حروف کی تکرار سے نظم، نظم معلوم ہوتی ہے اور ردیف سے حیرت
 کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ان کو دیگر اساتذہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں :-

مومن تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حسرت نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
 مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

جلیل محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں، طبعیاتی نہیں جاتی

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہیں، مگر دیکھنے کی تاب نہیں

دینا وہ آس کا سا غرے یاد ہی نظام

منہ پھیر کر ادھر کو، ادھر کو بڑھا کے تھ

نظام اپنی

اُردو ادب کی ترقی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

(۱) کل ہندوستانی انگریزی داں طبقہ آپس میں ہمیشہ اُردو میں بٹا
چیت کرے اور اُردو ہی میں لکھا کرے۔

(۲) دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے بکثرت ترجمے شائع ہوں۔

(۳) کتابیں بکثرت تصنیف کی جائیں، اور یونیورسٹیوں کے نصاب
میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔

انتخابِ کلام

حسنِ آدمِ مست، آدمِ عشق کو کچھ ہوش نہیں
اب کوئی شے نہیں جو میکدہ پر دوش نہیں

چشمِ میگیوں نے کیا ایک ہی جلو میں خراب
کیس کو اب دیکھوں، کہ اپنا ہی مجھے ہوش نہیں

ہٹ گئی خود، کہ ہٹالی گئی چہرے سے نقاب
بات کچھ ہو، نگرا اب تک وہ فراموش نہیں

چہرے نامِ تصور کے فنا ہونے کا
وصل وہ ہے کہ جہاں ہوش کو بھی ہوش نہیں

دیکھ کر جلوہ حق، سنت کو کیا ہے سجدہ
سنت بخولا ہوں، مگر قبلہ فراموش نہیں

کیا چھپائے گی، اثرِ حسن کے جلوے کو نقاب
برقِ ادا میں نہاں رہ سکیے بھی روپوش نہیں

ہاں بے اداں یاد خدا بھول گیا
قیلے کو قبلہ بنا بھول گیا

ہر کے سائل بھی نہ نکلا کچھ کام
دراپٹچا، تو صدا بھول گیا

لذتِ کافور میں ناوکِ مست پوچھ
در دھٹا، تو دوا بھول گیا

ایک دیوانے کی باتوں پہنچا
کیا خبر کیا کہا، کیا بھول گیا

ہاں ایک بات رہی باقی ہے
کچھ ابھی کہنے کو تھا، بھول گیا

ہو گئی سیکڑوں وعدوں کی وفا اُس نے ہنس کر جو کہا ”بھول گیا“
 یاد رکھنے کی سہ پہا یاد اُس کی اثر
 اور جو بھول گیا، بھول گیا

تم نوح کے کہاں جاؤ گے اربابِ نظر سے خوش قدم ابھرینگے گزر و گے جدھر سے
 آغازِ محبت ہو ا دل سے کہ نظر سے معلوم نہیں، نقشہ یہ اٹھا ہے کدھر سے
 ہر ذرے پہ جو بن ہی ہر اک شے پہ جوانی کچھ اور ہی عالم ہے، وہ گزر رہے ہیں جدھر سے
 کیا آپ رواں، کیا شب بے کیا گل لہا دُنیا سے حسین آج مرے حسنِ نظر سے
 کیا جوشِ رقابت ہے کہ ہنگامِ نظارہ بنا رہا ہوا جاتا ہوں میں خود اپنی نظر سے
 نسبت کا یہ صدقہ ہی کہ کرتے ہیں خدائی وہ چُمن چو نکالے گئے اللہ کے گھر سے

میکش نے کہا نشہ، تو صوفی نے کہا وجد

حال اپنا تماشا ہے، اثر، فرقِ نظر سے

وہ جو نہیں، تو بزم میں بزم کی شان بھی نہیں

پھول میں دلکشی نہیں، چاند میں چاندنی نہیں

ڈھونڈھا نہ ہو جہاں اُنھیں ایسی کوئی جگہ نہیں

پانی کچھ اُن کی جب خبر، اپنی خبر رہی نہیں

آنکھ میں ہو پرکھ، تو دیکھ حسن سے پُر ہو کل جہاں

تیری نظر کا ہر قصور، جلووں کی کچھ کمی نہیں

عشق میں شکوہ کفر ہے، اور ہر انتخابِ حرام

توڑنے سے کاسہ مراد، عشق اگر ہی نہیں

جوشِ جنونِ عشق نے کام مرا بنا دیا
اہلِ خرد کریں معاف، حاجتِ آگہی نہیں

اُف! اینٹیلی انکھڑیاں، ہاے ایہ مستیِ شباب
مانا کہ تم نے پی نہیں، کون کسے گا، پی نہیں

ہجر کی شب گزر گئی، پھر بھی اُتر یہ حال ہے
سائے آفتاب ہے اور کہیں روشنی نہیں

ساقیا! دور میں اب لا عوضِ جام کچھ او	کہ رہی ہر روشِ گردشِ ایام کچھ او
تا یکے حظِ دل و شہم کی سہی نا کام	تجھ سی لینا ہے، محبت، مجھے اکام کچھ او
یاد پھر آئی ہیں آغا زِ جنوں کی رلتیں	اور پیچھے کو ملے گشتِ گردشِ ایام کچھ او
حُسنِ کامرتہ حیرت نے سمجھنے نہ دیا	جننا و بکھا اُٹھیں، بڑھتا گیا ابنا کچھ او
حُسنِ پر قیدِ تعین سے اُدھر حرفِ کیا	اور اُدھر حدِ نظر نے کیا بدنام کچھ او
اک سے تکمیلِ نظر، ایک سے توں نظر	حُسنِ در پردہ جُدا، حُسنِ سیرِ با کچھ او

اُن کے وعدے ہی بدلتے نہیں دنِ اُلتا اُتر

حالِ عالم کا یہ ہی، صبح کچھ اور شام کچھ او

مقصودِ حیات

یاد ہی اتنا کچھ تاروں بھری وہ ایک رات	سو رہی تھی تجیرِ حُسنِ وقت ساری کا نشان
کاروانِ نور تھا آہستہ سرگرم سفر	تاکہ عالمِ لغزشِ پاسے نہ ہو زیرِ وزر
میں نے پوچھا افسانہ کے ماہ پارو، کچھ کو	زندگی کا کیا ہے مقصد، اسی ستارہ کو

ہی نجوم و ہنیت و تاریخ کا تم پر مدار
 جستجو میں کس کی پھرتے ہو پریشاں تم مدام
 کیسا افسانہ ہو، جو رہتا ہو ہر شب ناتمام
 سُن کے یہ چکر میں آتے رنگ چہروں کا اڑا
 آئی لرزے میں بنائے گنبدِ چرخِ کبود
 آہ! پھر تو گلِ ستارے نذرِ طوفانِ گئے
 دیکھ کر یہ پردہ مشرق سے نکلا آفتاب
 ظلمتِ گیتی مٹاتا تابشِ رخسار سے
 چہرہ روشن پہ ڈالے ایک تاریخی نقاب
 گیسو و شبِ پشت پر ڈالے ہوئے با احتشام
 دوش پر رکھے ہوئے بارِ نظامِ کائنات
 دہر پر بکھرا کے گیسوئے شعاعِ زرنگار
 جوش میں بولا زبانِ جال سے ”سُن، غور کر
 کاہلی ہے جس کی دشمن، عیش ہو جس پر حرام
 خدمتِ مخلوق جس کی زندگی کا ہو اصول
 زندگی نامِ عمل ہو، بے عمل بے جان ہے
 دیکھ پہلے بزمِ قدرت کے نظامِ کار کو
 ایک اک لمحے کو وقفِ خدمتِ مخلوق کر
 بگڑے کاموں کو بنا، گرتوں کا باز و خفام

اور شبِ غم کی بھیاں کے ات کا تم ہو سنگھار
 فکر کیا ہو، خوابِ غور جس نے کیا تم پر حرام
 انجمن پر انجمن کا کس لیے ہے اہتمام
 صورتِ شبنمِ سینہ خوفِ افشا سے بہا
 جھللا تیں نور کی شمعیں اٹھا طوفانِ دُور
 بات منہ سے کچھ نہ نکلی تھی کہ نہاں ہو گئے
 شب کی بخوابی سو آنکھیں سُرخ تھیں شل شہنا
 غسل کر کے آ رہا تھا چشمہٴ انوار سے
 جس کے پر تو سے شفق پرور تھا و اماں سجا
 ابلقِ ایام کی تھامے ہوئے زریں لگام
 کاسہ زریں سے سب کو بانسارِ زرقِ جفا
 ذوقِ خدمت کے جنوں میں کر کے دامنِ تازا
 زندہ وہ ہو جس نے خدمت کیلئے باندھی کمر
 خوابِ خور آرام و راحت سے نہیں کچھ چھو کا
 دوسروں کے غم میں اپنی ذات کو جاتا ہو بھول
 زندہ و مردہ کی دُنیا میں یہی پہچان ہے
 بات سب کی سُن، مگر دھیما نہ کر زقار کو
 گھر میں فاقہ ہو تو ہو، بھوکوں کا لیکن پیٹ بھر
 ورنہ تو اپنی بزرگی کا نہ ہرگز نام لے

آگ بھڑکے، تو عمل سے اپنے نو گلزار کر پانوں میں کاٹا چبھے، تو آبلوں سے پیار کر
 خدمتِ مخلوق سے ملتی ہی پائیدہ جیتا اور ملتا ہی اسی سے خالقِ کل کائنات
 پردہ غفلت کا تری آنکھوں سے جب ٹھٹھکا
 ذرے ذرے سے، اثر، تو درسِ عبرت پائیگا

انترصہبائی

۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء

1

2

3

4

5

6

7



پہچاننا۔

صبحِ لہجہ میں شامِ غمِ جامِ لُٹا میں الم۔

پر دہِ زلیست میں عدم لے لے یہ چستان یہ کیا

یا دہری شراب ہے دگر ترا سرور ہے۔

کینہِ طرب میں موزنِ میرا الیم وجود ہے۔

نکیرِ دل دگر نہ کرُ عشق میں جاں کبھی گزر۔

اس میں کہیں زباں نہیں اس میں زباں ہی سُرور ہے۔

اس میں نہیں کبھی کبھی کمرِ سرور و شیر۔

تیرے لے لے کا شہِ دل کو ہے ستار۔

دنیا کے ہر اک حسن سے بھونچے ہو کر

یہ صبحِ سکونِ کبھی کا معصوم ستار۔

نظم فرد
مہرِ سیحِ ہلِ اتر گیا - الیم ہے الی الی۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۱ء

راہم پور ریاست یوپی

اثر صہبائی

سرگزشت

عبد السبع پال نام ، اور اثر صہبائی تخلص ہے۔ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۱۶ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی احمد دین پال ہے۔ قد و قامت متوسط ، چہرہ کتابی اور رنگ سُرخ و سپید ہے۔ عادات و اخلاق شریفانہ ہیں ، اور طبیعت میں ژرف نگاہی پائی جاتی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں انٹرنس ، ۱۹۲۳ء میں بی ، اے آنرز ، ۱۹۲۵ء میں ایل ، ایل ، بی ، اور ۱۹۲۹ء میں فلسفے میں ایم ، اے ، پاس کیا۔ آج کل وکالت کرتے ہیں۔

۱۳ سال کی عمر سے شعر گوئی کا ذوق ہے۔ فطرت نے عاشقانہ مذاق عطا کیا ہے۔ ہمیشہ سے خوبصورت انسان ، دلکش مناظر اور تصویریں ان کے لیے جاذبِ قلب و نظر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ وکالت کی مصروفیت کے باوجود شعر و سخن کا مشغلہ جاری ہے۔

تین چار سال کی عمر میں والدہ کے آغوشِ شفقت سے محروم ہوئے ، ۱۹۲۴ء میں شادی ہوئی ، لیکن ۱۹۳۱ء میں رفیقہ حیات کے انتقال سے خانہ ویرانی ہو گئی ، اور ۱۹۳۸ء میں والد کا سایہ سر سے

اُٹھ گیا۔ ان صدمات سے اثر غیر معمولی متاثر ہوئے۔ ”راحت کدہ“ انہیں تاثرات کی یادگار ہے۔

باقاعدہ تلمذ کسی سے نہیں ہے۔ ابتدا میں کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی امین حزیں کو کلام دکھا لیتے تھے۔ بعد میں بعض مخلص احباب اور ماہرین فن سے بھی مشورہ کیا ہے، جن میں سے حضرت کیفی اور جناب اثر لکھنوی قابل ذکر ہیں۔

تصانیف میں ”جام صہبائی“ (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) ”دخستان“ (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) اور ”جام طور“ (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری اور دیگر علوم و فنون کی غایت اور مقصد کائنات کی صحیح ترجمانی اور تزکیہ نفس ہے۔ فلسفی شاعر اور پیغمبر دونوں اپنے اپنے رنگ میں ایک ہی کام انجام دیتے ہیں؛ ان کی راہیں مختلف ہوتی ہیں، لیکن منزل ایک ہی، اس لیے فلسفیانہ شاعر بالفاظ دیگر، روحانی شاعری ہے، جو شاعری کا سب سے اہم اور قدیم پہلو ہے۔

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ موجودہ دور کی جس قدر زندہ زبانیں ہیں ان کی بہترین کتاب کے عام فہم ترجمے بیش از بیش کیے جائیں، تاکہ اُردو ادب لطیف میں جوش و سرگرمی کی کمی پوری ہو جائے۔

دیگر زبانوں کے مانوس اور صاف الفاظ خواہ وہ ہندی کے ہوں یا سنسکرت کے، زیادہ سے زیادہ تعداد میں زبان میں دیکھے جائیں اور عربی کے مشکل الفاظ کو بجائے ہندی کے عام

الفاظ مل سکیں تو ان کو ترجیح دی جائے۔ سنسکرت کے صرف وہ الفاظ لیے جائیں جو موقع کی مناسبت کے لحاظ سے مافی الضمیر کی ترجمانی کرنے میں سہولت پیدا کر سکیں۔

ان کے نزدیک اشعار میں ردیف و قافیہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ نثر سے امتیاز کے لیے وزن کی ضرورت ہے۔

نظم میں علامہ اقبال کو اور غزل میں غالب اور میر کو استاد مانتے ہیں۔

ان کو اساتذہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں:-

میر	تیرے ایقاعے عہد تک نہ جیے
	عمر نے ہم سے بیوفائی کی
==	زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟
	ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
غالب	آگے آتی تھی حالِ دل پہنسی
	اب کسی بات پر نہیں آتی
اقبال	تجھے گرفتِ فقر و شاہی کا بتا دوں
	غریبی میں نگہبانی خودی کی

انتخابِ کلام

ظلمتِ دشتِ عدم میں بھی اگر جاؤں گا
لے کے ہمراہ مہِ داغِ جگر جاؤں گا
عارضِ گلِ مہوں، نہ میں نہ یہ بلبلِ گلچیں
ایک جھونکا ہوں فقط سن سگر جاؤں گا
اے فنا! ٹوٹ سکر گی نہ کبھی شتی، عمر
میں کسی اور سمندر میں اتر جاؤں گا
دیکھ جی بھر کے، مگر توڑ نہ مجھ کو، گلِ حیں
ہاتھ بھی تو نے لگایا، تو بکھر جاؤں گا
ایک قطرہ ہوں، مگر سیلِ محبت سے ترے
ہو سکے جو نہ سمندر سی بھی، کر جاؤں گا
دورِ گلشن سے کسی دشت میں لیجا، صبا
ہم صفیروں کے ترانوں میں تر جاؤں گا

صحینِ گلشن میں کئی دامنِ پچھے ہیں، ای اثر
اڑ کے جاؤں بھی اگر میں، تو کدھر جاؤں گا

ملی ہے جاں، مگر آرامِ جاں نہیں ملتا
کہیں جہاں میں دلِ شادماں نہیں ملتا
ہجومِ اشک میں گم ہو گیا سفینہٴ دل
کرانِ بحرِ غم بے کراں نہیں ملتا
خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جا
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا
دورِ شوقِ عبادت سے برقِ مضطربوں
مری جبیں کو مگر آستان نہیں ملتا
بنی ہے محفلِ ہستی نگارِ خاندۂ حسن
تلاش جس کی ہو، اس کا نشان نہیں ملتا
نہ چھٹیہر خدا! صاف صاف کہہ تھا
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا
ہر ایک نشے میں مضمحل رہے، ساقی
سرور و کیف کہ ہو جاوداں نہیں ملتا
قفس سے چھوٹ کے آیا ہوں سائنِ حنین
کہاں ہو؟ محکومِ آشیان نہیں ملتا
اتر، نوا سے پریشیاں ہوں بزمِ مستی میں
کوئی نہیں، کوئی رازِ داں نہیں ملتا

مری ہر سانس کو سب نغمہ محفل سمجھتے ہیں
گماں کا شانہ رنگیں کا ہر جہیز نگاہوں کو
اکہی کشتی دل بہ رہی ہو کس سمندر میں
طرب انگیز ہیں رنگینیاں فصل بہاری کی
بچھل کر دل لہو ہو چو بہ جاتا ہوا نکھوٹے
کہاں ہو گا ٹھکانا برق رفتار ان حشر کا
مگر اہل دل آواز شکستِ دل سمجھتے ہیں
اُسے اہل نظر گر درہ منزل سمجھتے ہیں
نکل آتی ہیں موجیں ہم جو ساحل سمجھتے ہیں
مگر بلبل انھیں خونِ رگ بسمل سمجھتے ہیں
ستھم ہو شمع کو جو زینت محفل سمجھتے ہیں
کہ وہ منزل کو بھی سنگِ رہ منزل سمجھتے ہیں

بگولے اڑ رہے ہیں جو ہمارے دشتِ خشک

انھیں کو اے آثر، ہم پردہ محل سمجھتے ہیں

یا دو جابیں لب مرے موجِ ثراب میں
انگڑائی لیتے اُٹھے جو وہ خوابِ ناز سے
ڈوبی ہوئی نگاہ ہے رنگِ حجاب میں
جس حُسن کی ہے چشمِ تمنا کو جستجو
یا موسمِ بہار نہ آئے شباب میں
ہر چیز غرق ہو گئی رنگِ شباب میں
یا کوئی نوشگفتہ کلی نیم خواب میں
وہ آفتاب میں ہو نہ ہو ماہتاب میں

ہستی کو پھونک دیں گے آثر شعلہاے عشق

خاکِ سیاہ ہو کے رہو گے شباب میں

لطف گناہ میں ملا، اور نہ مزہ ثواب میں

عمر تمام کٹ گئی کاوشِ احتساب میں

تیرے شباب نے کیا مج کو جنوں سے آشنا

میرے جنوں نے بھر دیے رنگِ تری شباب میں

آہ ایہ دل، کہ جاں گداز جو شش اضطراب ہے
ہائے اوہ دور، جب کبھی لطف تھا اضطراب میں

قلب تڑپ تڑپ اٹھا، روح لرز لرز گئی
بجلیاں تھیں بھری ہوئی زمرنہ رباب میں

چرخ بھی مے پرست ہے، بزم زمیں بھی مست ہے
غرق بلند و پست ہے جلوۂ ماہتاب میں

میرے لیے عجیب ہیں تیری یہ مسکراہٹیں
جاگ رہا ہوں، یا تجھے دیکھ رہا ہوں خواب میں

میرے سکوت میں نہاں، ہر مرے لکی داستاں
بُھک گئی چشمِ فتنہ زار، ڈوب گئی حجاب میں

لذتِ جامِ جم کبھی، تلخیِ زہرِ عنسم کبھی
عشرتِ زلیت ہے، اثر، گردشِ انقلاب میں

تمہاری یاد میں دنیا کو ہوں بھلائی ہوئے
تمہارے درد کو سینے سے ہوں لگای ہوئے
عجیب سوز سے بہرِ نین میں مرے لغمے
کہ سازِ دل ہے محبت کی چوٹ کھادی ہوئے
جو تجھ کو کچھ بھی نہ ملنے پہ خوش ہیں، اسی ساقی
کچھ ایسے رند بھی ہیں میکدی میں آئی ہوئے
تمہارے ایک تبسم نے دل کو ٹوٹ لیا
رہے ہوں پہ ہی شکوے ہوں پہ آئی ہوئے

آثر بھی راہِ رودشتِ زندگانی ہے
پہاڑِ غم کا دل زار پر اٹھائے ہوئے

تھاری فرقت میں میری آنکھوں سے خوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں
 سپہرِ الفت کے ہیں ستارے کہ شامِ غم میں چمک رہے ہیں
 عجیب ہے سوز و سازِ الفت، طربِ فزا ہے گدازِ الفت
 یہ دل میں شعلے بھڑک رہے ہیں، کہ لالہ و گل مہک رہے ہیں
 بہا رہے یا شرابِ رنگیں، نشاطِ افروز، کیفِ آگیں
 گلوں کے سانغِ چمک رہے ہیں، گلوں پہ بلبل چمک رہے ہیں
 جہاں پہ چھپا یا صاحبِ مستی، برس رہی ہے شرابِ مستی
 غضب ہے رنگِ شبابِ مستی کہ رند و زاهد بہک رہے ہیں
 مگر اثر ہے خموش و حیراں، حواسِ گم، چاک چاک داماں
 یوں پہ آہیں، نظر پریشاں ہے، رُخ پہ آنسو ٹپک رہے ہیں

پھول اور ستارہ

میں لالہ صحرا ہوں، تو عرش کا تارا ہے
 چاہوں کہ پہنچ جاؤں اڑ کر تری محفل میں
 پر میری تنگ و دو کیا کچھ دُور ذرا اڑ کر
 پھر خاک پہ گر جاؤں گرتے ہی فنا ہو جاؤں
 تو عرش کا تارا ہے، میں لالہ صحرا ہوں
 تیرے لیے ممکن ہے تو چاہے تو بن جاے
 قطرہ مئے شبنم کا اور صبحِ بھاراں میں

۴۴
میرے دل سوزاں پر اک بار برس جائے
نوعرش کا تار ہے، میں لالہ صحرا ہوں

دعا

مری رگ رگ میں برقِ طور بھر دے	دل تار یک کو پڑ نور کر دے
مجھے معصوم انوارِ سحر دے	مجھے دے شام کے خاموش نغمے
مجھے اپنے کرم سے وہ نظر دے	جو تجھ کو دیکھ لے ہر ایک شے میں
مری آنکھوں کو وہ برق و شر دے	جلادے چرخ و خاشاکِ باطل
مجھے وہ ہمیتِ قلب و جگر دے	فلک کے ہر ستم پر مسکرا دوں
مجھے عشق و محبت کا گھر دے	خزانے میں ترے لاکھوں گھر ہیں
مئے عرفاں کے دواک جام بھر دے	مجھے اپنے خمستانِ کرم سے

اثر کی التجا تجھ سے یہی ہے

دعاے صبح گاہی میں اثر دے

مُحِبَّت کے کرشمے

ستاروں نے بڑھ کر مجھے روشنی دی	ستاروں کو میں نے محبت سے دیکھا
چمک مہرنے، چاند نے چاندنی دی	جو پھیلا دیا میں نے اُفت کا دامن

سحر نے مجھے اپنی پاکیزگی دی	سحر کے لیے میں نے اک گیت گایا
مجھے اپنی مستی بھری تازگی دی	جو پھولوں کو چوماتا تو پھولوں نے ہنس کر

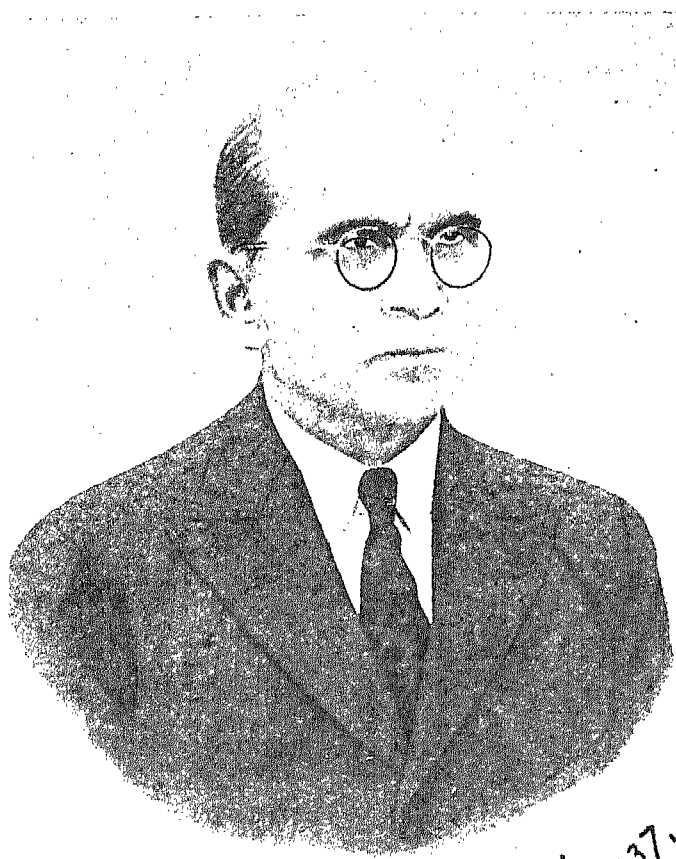
نظر بھر کے دیکھا جو روئے شفق کو شفق نے مجھے اپنی رنگینیاں دیں
جو جنگل میں گھومنا تو خاموشیوں نے مجھے اپنی پُر کیف شیرینیاں دیں

محبت سے میں نے کیا ایک سجدہ گرا پائے یزداں میں بہوش ہو کر
اٹھا کر محبت سے یزداں نے مجھ کو جگہ عرش پر دی، ہم آغوش ہو کر

جب دھبی رات کو دنیا سکوں کی نیند سوتی ہے
مراد دل تھر تھرا اٹھتا ہے میری آنکھ روتی ہے
تمھاری یاد آکر چھیڑتی ہے بربطِ دل کو
مرے نغموں میں اک دنیا بے غم آباد ہوتی ہے

ہوئے خاموش آغازِ محبت کے حبسِ نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے
بس اک ٹوٹا ہوا دل یادِ گارِ عشق باقی ہے
کچھ آنسو ہیں کچھ آہیں اور کچھ اندوگہیں نغمے

انزکات‌نوی



Asar.
Nov. 1937.

نزل (۱۱)

آغازِ مہبت کی لذت انجام میں پانا شکل ہے
 مصدقِ دل رسد سے رہتے تھے اب ہو گنا شکل ہے
 شرابیِ رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی تھی ہے کہ بس خواب
 نئے تو دھانا کتاب، حار دیہی جگنا شکل ہے
 طائر ہے نہ صید و حسن ہے دل ہے البتہ شریا دل
 یہ کچھ تو درم کر کش تو کرو کیا ایسا نانا شکل ہے ؟
 کچھ ستھرا ست پر تو رہے ہو مگر ستم بھی کرے دہر
 حاروں کا گلیاے وہ ان کو نہیں چکے رو دانا شکل ہے
 جوشنِ سدا کے ہر ہیں ان سے بچہ تم کیا بار
 کب اس کا ہوا شکل ہے اور کب لی حانا شکل ہے
 کہتے کہ تو ہم آؤ کہ سیدہ کہتے ہیں، سو کیا کیا کچھ
 العاد ہے اس جو یہ بھی یوں دل رکھنا شکل ہے
 موسمِ درد و فتنہ کی باتیں ہیں راس ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
 دور سے کس کو لڑاں ہے اسے دو شک بنا شکل ہے
 کہتے کہ تو بدلے کہتے کہ حسرت تو مکن جب پر چا
 موعودے کا تھے وہ گئے ہیں حال سنا شکل ہے
 میں تیرے کام میرا ہوں افسوس اس کے حال کا نا مل ہوں
 ہاں سرور تم کہہ لیتے ہر وہ لول نا شکل ہے

اثر لکھنوی

سرگزشت

میرزا جعفر علی خاں نام، اور اثر تخلص ہے۔ ۱۲ جولائی ۱۸۸۱ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی۔ کٹرۃً اہل تہذیب میں آبائی مکانات ہیں۔ سلسلۂ نسب حکیم میرزا علی حسین خان بہادر مخاطب بہ مسیح الدولہ ابن میرزا علی خاں حکیم الملک سے ملتا ہے، جو لکھنؤ کے شاہی اطباء میں ممتاز ترین شمار کیے جاتے ہیں۔

فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر ۱۸۹۶ء میں جوہلی ہائی اسکول لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں انٹرنس پاس کر کے، کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۸۹۸ء میں ایف، اے اور ۱۸۹۹ء میں بی، اے پاس کیا۔ ایک سال، ایم، اے کا کورس پڑھا اور اپریل، ایل، بی کی تیاری کی، لیکن طبیعت میں قانون سے مناسبت نہ پا کر یہ سلسلہ صورت دیا۔

۱۸۹۹ء میں صوبہ متحدہ کی پرائیمری سول سروس میں بطور پٹی کلکٹر داخل ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں عراق کا سفر کیا۔ ۱۹۰۱ء میں کلکٹری کے عہدہ پر مستقل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ”خان بہادر“ کا

خطاب ملا۔ ۱۹۳۹ء میں ایم، بی، ای، کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔
 ۱۹۴۳ء میں پنشن لی، مگر اس کے بعد ہی قسمتِ الہ آباد کے اڈیشنل
 کمشنر مقرر ہوئے، اور یہاں سے ریاست کشمیر کے مشیر ترقیات
 کے عہدے پر سرفرازہ کیے گئے۔ اس وقت کشمیر میں ہوم ممبر ہیں۔
 جناب اثر درمیانی قد و قامت، فراخ پیشانی، اور گندی رنگ
 کے خوش فکر شاعر، نقاد اور ادیب ہیں۔

جناب میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے شاعری میں تلمذ ہے۔
 فرماتے ہیں:

اثر ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیز استاد

نکالتا ہوں نئے راستے زباں کے لیے

جناب اثر نے جن آغوشوں میں پرورش پائی، وہ زبان کا گہوارہ
 تھے، اور بلحاظ فصاحتِ زبان ”ثقافتِ کٹرہ“ کے لقب سے پکارے
 جاتے تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ جناب اثر کو اپنی زبان سے خاص انس
 ہے، فرماتے ہیں:-

صناع، شل آتش، ہیں میرزا اثر بھی

دیکھو تو جڑ رہے ہیں الفاظ کیا نگیں سے

انگریزی زبان کے فاضل ہیں، مگر اردو تحریر یا تقریر میں انگریزی
 الفاظ بے ضرورت صرف نہیں کرتے۔ شاعری کا ذوق فطری ہے، اور
 کلام میں آتش کی طرح زبان کا چٹخارہ اور تیر کی طرح جذبات کی
 فراوانی ہے۔ فرماتے ہیں:-

شاعری لطیف زباں تک نہیں محدود اثر ساتھ ہی ساتھ فراوانی جذبات بھی ہو

میر و غالب دونوں کے دلدادہ ہیں، جیسا کہ ان کے رنگِ کلام اور اشعار ذیل سے واضح ہے:-

اثر ہے میر سے نادیدہ بعیت نہ کیوں تاثیر ہو میر کے سخن میں
میر و غالب سے اثر ہے گرمِ سخن وہ حسدائی کر گیا اور یہ پیہر ہو گیا
ملازمت کے زمانے میں ادبی ذوق، اور شعرو شاعری کا شغل بڑا

جاری رہا اور اب بھی بدستور باقی ہے۔

کلام کے دو مجموعے ایک ”اثرستان“ ۱۹۳۷ء میں اور دوسرا
”بہاراں“ ۱۹۳۹ء میں طبع ہو چکے ہیں۔

انتخابِ کلام

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

دارِ فانی سے جہاں اغ لیے میں اٹھا
یاد آؤں گا بہت، دھیان رہے بس اتنا
دلِ اشیانِ ستم، آنکھوں میں تصویرِ وفا
کام ہو گا نہ کوئی اور تمہیں اس کے سوا
پوچھو گی شام کے تاریکی کبھی میرا پتا
موجِ ساحل سے کہو گی کہ ہو دیکھنا، تو بتا
دشت کا جس میں تیشِ دفن ہو، ایک اکثر
نقشِ بن جائیگا میرے ہی ڈھرتے دل کا
دو گی جا جا کے فلک سے پہاڑوں میں صدا
دیں گے آوازِ پیرِ آواز، مگر حاصل کیا
گنگنائی ہوئی گزرے گی ادھر باوِ صبا
ٹوک کر پوچھو گی، کچھ تو ہی بتا دیتی جا
یاس میں لب پہ مکر یہ سخن آئے گا
کیا ہوا، کیا ہوا، وہ چاہنے والا میرا

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

خواب سے چونکو گی، کہتی ہوئی، آیا کوئی
لے کے آہستہ مرا نام پکارا کوئی
دلِ بتیاب پہ اک سایہ سالرزِ اکوئی
دیکھوں کس طرح، کبھی مجھ کو تماشا کوئی
مُسکراتا ہوا آغوش میں لے گا کوئی
جانِ مشتاق! نہ رہ جاتے مٹنا کوئی
سو نا بستر کئے گا، اب نہ جب تھا کوئی
آکے سینے میں ستا تا ہے ستا یا کوئی
دل یہ بھر آئیگا، پھوٹے کہیں سوتا کوئی
اشک یوں اٹینگے، ہو جوش میں یا کوئی

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

ٹوٹ جائیگا یکایک جو کوئی تارِ باب
سب کہیں گے، اُسی بہنجیت کے ہر دل کا جو آ
یاد آ جائیگا، تم کو کوئی بھولا ہوا خواب
نغمہٴ دورِ طرب، دلولہٴ حشرِ شباب

صحبۂ جن کا ہر اک لمحہ تھا ہم رنگِ نرِ سب
کیف میں ڈوبی ہوئی، حیف مگر برقِ شب
داستانِ ہجر کی بن جائیگا ہر شکِ خوش آب
کوئی حسرت کا مرقع، کوئی حرام کی کھتا
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

زیرِ دیوار بچھائے گی چمیلی چادر
گوندھنے بیٹھو گی تم پھولوں کا ناز کرنے پر
ہاتھ یوں کانپیں گے اس وقت تمہارا ہاتھ
ڈرہا گیا، نہ ہوں چوڑیاں ٹھنڈی لڑکر
اور گماں ہو گا یہ مرجھائی ہوئی کلیوں پر
کوئی ہے آہ بلب اور کوئی خاک بسر
ہو گا محسوس تمہیں گور کا میری منظر
برگِ آشفۂ گل، قطرہٴ شبنم سے تر
جس کا ہر ذرہ ہے اک نالہ محروم اثر
نہ تصور کبھی بندھ جائے گا جب کچھ پہر
ہے بہت، آئے جو ہمراہِ صبا وقتِ سحر
تپشِ ہجر سے لودے اٹھے گا تارِ نظر
اور اس تار میں پھول اشکوں کے خود بدھ بدھ
دیں گے ”پڑ مردہٴ تبسم“ یہ پچھا ور کی خبر
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

مرد و شِ آئینگی جس وقت ہو اساون کی
مست و سرشار جوانی سے پے سرگوشی
آسماں ہو گا یہی اور زمیں ہو گی یہی
منزلِ مرگ کا ہوں گا فقط اک میں سہری
یاد آئے گی تمہیں تنگیِ آغوشِ مری
اپنی ہی باہنوں کو تم آپ یہ دعوتِ دوگی
ہو گی خواہش کہ ہو بوسوں کی تمنا یوری
مستحق جس کی تھی اکدن مری شویدہ مری
ہونٹِ تھرائیں گے ہنسنے میں بناوٹِ گہنی
میٹھی چٹکی بنے گی سیج کی ایک ایک کلی
میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

موجیں گنگا کی وہ منہ کھولے ہوئی شلِ ننگ
کرتی تھیں ناؤ سواٹھیلیاں بے ننگ و ننگ
رات اور ناؤ میں ہم، صبح کبھی اور کبھی ننگ
گھپا اندھیرے میں فقط پریم کی روشن مہر

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

زرفشاں چاندنی سی بامِ فلک جیسے گا
سازِ انجم پر مے نغموں کی گونجے گی صدا
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پر یہ ہو گا دھوکا
ڈوبت کوئی ستارا جسے کسی کا جو یا

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

رقص کرتا ہوا لپکے گا بھیانک طوفاں
برقِ اِدھر قہقہہ زن، رعد اِدھر نعرہ کیاں
شور وہ تند ہواؤں کا وہ باد و باراں
جیسے نہ خیر نہ رُخا تا ہو کوئی پیل دماں
وہ ڈریٹے وہ تھپیڑے کہ بس اللہ کی ما
جھولا جھولے گی اٹا مری وہ قیامت کا سماں
اُس پتہ رستہ اندھیری کہ گھٹو جیسے دھواں
واہتم شکلوں سے آباد کرے گا یہ جہاں
منہ سواکچ خچ نکل جائیگی، دل ہو گا تپاں
تم مجھے ڈھونڈو گی، افسوس نہ پاؤ گی نشاں
عافیت بخش جو بازو تھے وہ ہو گئے بے جاں
گرم بوسے وہ کہاں، دور ہو جن سے خفاں

میں نہ ہوں گا تو بہت یاد کرو گی مجھ کو

آگینے

یاد آگیا پھر اک بہت رونا غضب غضب
زنجیں خرام، کیف سراپا، غضب غضب
سج دھج ترالی، وضع انوکھی، اداسی
آواز، جیسے گیت سر بلایا، غضب غضب
لہجے میں لوچ، لوچ میں وہ نرم نرم تر
لہرا سجا تیں جیسے کہنہ، غضب غضب
آنکھوں میں نیند، نیند میں ڈورا خا کا
نازک سے آگینوں میں بیٹھا غضب غضب
وہ پتلیاں کہ مانسور در کی جھیل میں
پینوں کی ناؤ کھیتے ہوں تو نا غضب غضب
ایرو وہ بانکے، بات پتہ تلوار سوت لیں
اور کرویں ایک کچھانہ دیکھا غضب غضب

پلکیں گھنیری، گوپیوں کی ٹوہ کے لیے
 اور اُن کی اور چھپو روہ چپ چوڑیوں میں
 ان بستنیوں میں پل کے جواں ہوں چستیاں
 پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کل جلی کہ ہاں ہاں
 مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا
 اُن لیے لمبے بالوں میں گھونگھر کی لہری
 اُن گورے گورے گالوں پر اک لٹ لٹا پٹ پٹ
 وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی
 وہ چلبلی ادائیں، اداؤں کے ساتھ ساتھ
 اپنی ہنسی پہ غصہ، کبھی غصے پر ہنسی
 اُف اُف وہ پور پور میں مہندی چھی ہوئی
 اس واسطے ”چنگیز“ ہتیلی کی دیکھ لوں

راوٹا کے جھانکنے کا چہرہ کا غضب غضب
 لٹیں، مگر ذرا جو ہو کھٹکا غضب غضب
 اُن بستنیوں کا کیا ہر ٹھکانا غضب غضب
 جیسے کنول کی تاک میں بھی نرا غضب غضب
 جس کا پے کام دیو بھی پیسا غضب غضب
 کروٹ سی جیسو ہتی ہو گنگا غضب غضب
 فوراً تھا چہرہ لال بھوکا غضب غضب
 یا قوت اتنا سرخ نہ چوکھا غضب غضب
 نقضوں کا بار بار پھر کتا غضب غضب
 سونا لٹا دیا، کبھی رو یا غضب غضب
 ٹیسو کا پھول دیکھا تو ہوگا غضب غضب
 انگریزی توڑنے کا ہانا غضب غضب

بھر کا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
 کھینچتا تھا عطر، یا تھا پسینا، غضب غضب

اک تشنہ کام شوق کی حسرت بھری نظر
 بکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب
 وہ التفات بخشش بے حد کہیں سے
 دل بقرای عرض تمن، غضب غضب
 اُس پردہ بکے ہونٹ وہ کتنا غضب غضب
 پرسش کے بعد بخشش یہ جہاں غضب غضب

گفتار کو شہی لب میگوں کے ساتھ ساتھ
 شرمندگی، حیا کا تقاضا غضب غضب

میتابیوں نے ہوش سے بیگناہ کر دیا برہم ہوئی وہ نرم تماشا غضب غضب
 اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جانِ آرزو محرومیاں ہیں اور دلِ شیدا غضب غضب
 جوشِ جنوں میں وہ بھی آثرِ چاک ہو گیا
 ہلکا سا رہ گیا تھا چورِ داغِ غضب غضب

آغازِ محبت کی لذتِ انجام میں پانا مشکل ہے
 جب دل کو مسوسے رہتے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے
 متوالی سیلی آنکھوں میں نیند ایسی گنتی ہو کہ بس تو ہے
 فتنے تو اٹھانا اک جانب، جادو بھی جگانا مشکل ہے
 طائر ہے، نہ صیدِ وحشی ہو، دل ہو، البتہ ٹڑپنا دل
 دیکھو تو ادھر، کوشش تو کرو، کیا ایسا ناشناکل ہے
 کچھ مشرقِ ندامت ہوتی ہو، کچھ عذرِ ستم بھی کرتے رہو
 جانوں کے کھپانے والوں کو نہیں سننے کے رُلا نا مشکل ہے
 جو عشق کے فن کے ماہر ہیں ان سے پوچھو، تم کیا جانو
 کب لاشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے
 کہنے کو تو ہم آزار کشیدہ کہتے ہیں اس کو کیا کیا کچھ
 انصاف یہ ہو اس جو رہے بھی یوں دل کو بھانا مشکل ہے
 موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ سب باتیں ہیں
 رونے میں کبھی طوفاں تھے، اب دواشک بہانا مشکل ہے

کہنے اور طول سے کہنے کی حسرت تھی لیکن جیب چھپا
مُنہ اُس کا تکتے رہ گئے، یعنی حال سنانا مشکل ہے

میں میر کا دم بھرتا ہوں آثر میں اُس کے کمال کا قائل ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو، وہ بول سنانا مشکل ہے

کوئی اس طرح سا ون گارہا ہے	دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے
سُروں میں ڈوبالہ بانسری کا	قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے
ٹھو کے دے رہی ہن بھگی تائیں	کلیجائے مٹھ کو پیسہ آ رہا ہے
پہیا ٹیرتا ہے کہ کے ”پیو، پیو“	یہ پانی اور بھی تڑپا رہا ہے
اُدھر آواز میں لگتی ہے پتی	ادھر دل ہو کہ بیٹھا جا رہا ہے
بھری برسات اور یہ گھپا اندھیر	اندھیر آپ سر ٹکرا رہا ہے
کسی کوتیل میں جیسے ڈبوؤ	یونہیں سینے میں دم گھبرا رہا ہے
اندھیری رات میں کوتدالیک کے	دبی جو آگ تھی بھڑکار رہا ہے
اُدھر چنگھاڑتے ہیں موڑا دھڑل	پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے
چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں	فلک چنگاریاں برسا رہا ہے
مسلسل نغمہ تھی جھینگری جھنکا	دل اب آزار جس سے پار رہا ہے
سہاگن رات کا جلتا ہوا جل	مراک اک رواں تھرا رہا ہے

یہ رات اور یاد آثر اک بیوفا کی

بس اب رہنے دو، رونا آ رہا ہے

اپنی وفانہ اُن کی جفاؤں کا ہوش تھا
 کیا دن تھے جب کہ دل میں محبت کا جوش تھا
 صورت بھی دیکھے اور تری باتیں بھی سُن سکے
 گلِ چشمِ شوق بن کے طلبگارِ گوش تھا
 ہر جلوہ ایک پردہ تھا، ہر دل تھا اک حجاب
 بیگانگی کا بزمِ تنہا میں جوش تھا
 سازِ حیات بند تھا، دم تھے رُکے ہوئے
 اُس جلوہ گاہِ ناز میں جو تھا خموش تھا
 ناکامیوں کی باغِ تنہا میں تھی بہار
 گلِ ریزِ داغِ دل تھے، جگر گلِ فروش تھا
 دونوں کو اک نگاہ پہ متربان کر دیا
 دل جان کا عذاب تھا، سرِ بارِ دوش تھا
 کی صرف ہم نے عمر، سمجھنے میں رازِ عشق
 طاعت گزار ہوتے، کہاں اتنا ہوش تھا

احسانِ دانش

۱۳ اپریل ۱۹۴۱ء



انسان و خداوند را با هم می شناسد
 یعنی هر که از این سه چیز اجتناب کند
 خداوند او را دوست دارد و هر که از این سه چیز
 اجتناب نکند خداوند او را دشمن دارد
 و هر که از این سه چیز اجتناب کند
 خداوند او را دوست دارد و هر که از این سه چیز
 اجتناب نکند خداوند او را دشمن دارد

الحمد لله
عبد الرحمن بن عبد الله
البرقي

[illegible]

احسان دانش

سرگزشت

احسان الحق نام، اور احسان تخلص ہے۔ والد کا نام قاضی دانش علی اور خاندانی وطن قصبہ باخیت ضلع میرٹھ ہے۔ بعض اسباب سے قاضی صاحب نے قصبہ کاندھلہ، ضلع مظفرنگر، میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہیں ۱۹۱۷ء میں احسان پیدا ہوئے۔

قاضی صاحب کے پاس اچھی خاصی جائیداد تھی مگر بد قسمتی سے سب کھو بیٹھے، اور بالآخر ایک ٹھیکے دار کے یہاں مزدوروں کے میٹ ہو گئے۔ کبھی کبھی انھیں مزدوری بھی کرنا پڑی۔ اُس زمانے میں احسان اپر پرائمری کے تیسرے درجے میں پڑھتے تھے۔ جب تیسرا درجہ پاس کر لیا، تو چوتھے درجے کی کتابوں کے لیے رفیق باپ کو گھر کے تانے کے برتن فروخت کرنا پڑے۔ لیکن چوتھے درجے کے بعد باپ کے ساتھ مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے، اور تعلیم ترک کر دینا پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد میونسپلٹی کے چپراسیوں میں جگہ مل گئی۔ یہاں کے افسروں کے بیجا برتاؤ پر ترک ملازمت کر کے لاہور چلے گئے، اور سامان عمارت ڈھونے والے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔

ان کا اپنا قول ہے کہ:-

”علاوہ دیگر عمارتوں کے دیال سنگھ کالج اور پنجاب

یونیورسٹی کے دفتر پر مزدوری کرنے کا مجھ کو فخر ہے“

تاہم اُس زمانے میں بھی دوپہر اور شام کو فرصت کا جتنا وقت ملتا، اُسے کتب بینی میں صرف کرتے۔

کچھ عرصے کے بعد لاہور کی ایک سیرگاہ میں چوکیداروں میں ملازم

ہو گئے۔ اس دوران میں تنہائی اور مفت کی روشنی کی بدولت

مطالعے کا خوب وقت ملا۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ جگہ تخفیف ہو گئی

تو ریلوے کے دفتر کے چیراسیدوں میں ملازمت کر لی۔

ریلوے کی نوکری چھوڑ کر گورنمنٹ ہاؤس میں باغبانی کرنے لگے۔

اس کے بعد گیلانی بک ڈپو میں بیس روپے ماہوار کے ملازم ہوئے۔

اب عرصے سے اپنا ذاتی کتب خانہ ”مکتبہ دانش“ کے نام سے لاہور

کے محلہ مزنگ میں چلا رہے ہیں۔

احسان گرے سانولے رنگ کے، درمیانہ قد، متین اور سنجیدہ

جوان، اور خوش مزاجی، سادگی، انکسار اور تواضع کا مجسمہ ہیں۔ دہشت

احباب کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔

شاعری کا آغاز ریلوے کے دفتر کی ملازمت کے زمانے میں ہوا،

مگر تلمذ کسی سے نہیں ہے۔

ان کے خیال میں شاعری کا معاشرتی پہلو اہم تر ہے اور زندگی

کے جذبات و واقعات کو عام فہم اُردو میں روایت و قافیہ کی پابندی کے

ساتھ سامعہ نواز ہجو میں ادا کرنا اولیٰ ہے۔

احسان ہندی بھی جانتے ہیں، لیکن ہندی کے غیر مانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

اساتذہ متقدمین میں میر کو، متوسطین میں غالب کو، اور دورِ حاضر میں فانی بدایونی کو استاد مانتے ہیں، اور نظم میں میر انیس کے مدح ہیں۔ احسان کو دیگر اساتذہ کے یہ اشعار پسند ہیں۔

میر شام ہی سے بچھا سا رہتا ہے

دل ہے گویا چسراغِ مفلس کا

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے

ڈھونڈھا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کے

غالب کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہرئی یارانِ وطن یاد نہیں؟

فانی فانی، مرے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی

سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ لپٹا

رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پائے

ان کے منظوم کلام کی پانچ جلدیں حسبِ ذیل ناموں سے طبع

ہو چکی ہیں :-

(۲) چراغاں

(۱) نوائے کارگر

(۴) جادۂ نو

(۳) آتش خاموش

(۵) نفیرِ فطرت

انتخابِ کلام

کلیر کا عرس

صابر کے درِ پاک کے بے صبر فقیر و بہرِ پ ہو، بہرِ پ، صداقت ہو ^{قصد}
 مانا کہ یہ درِ یوزہ گری ہو تمہیں شایاں ورنہ میں ملی ہو تمہیں غیرت نہ شجاعت
 جو مرد ہیں لیکن، وہ گدا کی نہیں کرتے

تم دامنِ تہذیب پہ ہو داغِ نجاست
 تم شرک کے دلال ہو بدعت کے نمک خوار سینوں میں جا لاہونہ روحوں میں حرار
 مبروص عقیدوں میں میں مغلوج ارادے مغلوج ارادوں میں ہو قوموں کی ہلاکت
 چہرے ہیں کہ بیمار دماغی کے مرقعے
 چلے ہیں کہ ایمانِ فردشی کی شہادت

جس صاحبِ عرفاں کا تمہیں نام ہو اربہ تعلیم ہے اُس مردِ مجاہد کی قناعت
 آنکھیں ہیں تو آئینہ اٹھاؤ کہ تمہارے بشروں سے نمایاں ہو ضمیروں کی عکاس

وہ قوم سرفراز کبھی ہو نہیں سکتی

جس قوم میں ہوتی ہزاروں کی تجارت

پُرسشِ غم کا شکریہ، کیا تجھے آگہی نہیں؟

تیرے بغیر زندگی درد ہے، زندگی نہیں

دل کی شکستگی کے ساتھ جنتِ میکدہ گئی

فرصتِ میکشی تو ہے، حسرتِ میکشی نہیں

درد تھا اک، گزر چکا، نشہ تھا اک، اُتر چکا

اب وہ مقام ہے، جہاں شکوہ بے رنجی نہیں
تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں

دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں
اشکِ رواں کی آہِ تابِ کرنہ عوام میں خزا

عظمتِ عشق کو سمجھ، گریہ غمِ ہنسی نہیں
عرصہٴ فرصتِ حیاتِ ایسا طویل تو نہ تھا

تم مجھے بھولتے ہو کیوں، میں کوئی اجنبی نہیں
لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے، وقت نہ وہ خدا دکھائے

جب مجھے ہو یقین کہ تو حاصلِ زندگی نہیں
عشرتِ خلد کے لیے زاپہ کم نظر ٹھیکے

مشرّبِ عشق میں تو یہ جُرم ہے، بندگی نہیں
زخم پہ زخم کھائے جی، اپنے لوہے کے گھونٹ پی

آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہی دل لگی نہیں
ایک وہ رات تھی کہ جب تھامی گھر وہ ماہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہی چاند فی نہیں

باتِ حسن میں یوں عشق شامل ہوتا جاتا ہے

جو ذرہ جگمگاتا ہے، مراد ل ہوتا جاتا ہے

وہ آغازِ جفا تھا، درد کی دل کو شکایت تھی
یہ انجامِ وفا ہے، درد بھی دل ہوتا جاتا ہے
مجھے اے کاش تیری بے رخی مایوس کر دیتی
مگر مایوس ہو جانا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے
مجھے تو ناز تھا ساحل پہ طوفاں آشنائی کا
یہ کیوں ذکرِ صبا سارا ان محفل ہوتا جاتا ہے
یہ کیا سمجھا رہے ہو تم مجھے پردے میں محفل کے
مرارنگ تغزل، رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے
حضور میں بھی بتیابی ہے دوری میں بھی بتیابی
سکونِ دل بہر تقدیر مشکل ہوتا جاتا ہے
محبت میں مکان و لامکاں ہیں دو قدم لکین
مجھے یہ دو قدم چلنا بھی مشکل ہوتا جاتا ہے
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں شمعیں بجھتی جاتی ہیں
مرتب خود بخود انجامِ محفل ہوتا جاتا ہے
بہت دن سر دھنا ہے مجرمِ آغازِ محبت پر
اور اب انجام سے احسان غافل ہوتا جاتا ہے

ایک ٹھیکیدار سے خطاب

زر کے بل بوتے پہ فردوروں سے اتنا اجتناب
گفتگو کی ہر ادا بیگانہ آداب ہے
فقرے فقرے سے پکتا ہے اخوت کا لہو
گرم پلکوں میں مروت کی لچک پایا ہے
عشترنوں کی چند نازک ساختوں پر یہ غرور
یہ تو اک اندھے شرابی کا سُہانا خواب ہے

رعنائی کو نین سے بیزا رہیں تھے ہم تھے ترے جلوہ کے طلبگار ہیں تھے
پتھر کبھی گلیوں پر برستے تھے ہیں پر دیوانہ گر کو چسپ و بازار ہیں تھے
ہو فرق طلبگار و پرستار میں او دوست دنیا تھی طلبگار و پرستار میں تھے
اس بندہ نوازی کے تصدق محشر گویا تری رحمت سزاوار ہیں تھے
دے دے کر نگاہوں کو تصور کا سہارا توں کو ترے واسطے بیدار ہیں تھے
پتہ پاؤ گے، دیکھو ہمیں بیگانہ سمجھ کر مانو گے کسی وقت کہ غمخوار ہیں تھے
بازارِ ازل یوں تو بہت گرم تھا لیکن لے دیکھ مجت کے خریدار ہیں تھے
ہاں آپ کو دیکھا تھا مجت سے ہیں نے جی، سارے زمانے کے گنگار ہیں تھے

احسان ہے بے سود گلہ اُن کی جفا کا

چاہا تھا انھیں ہم نے، خطا وار ہیں تھے

سنور کے بزمِ ازل میں جو زندگی آئی قصا کے ہونٹوں پہ بسیاختہ ہنسی آئی

بڑی جفائیں اٹھاتیں بڑے ستم جھیلے
بہت دنوں میں رہ و رسم عاشقی آئی
نصیب عشق نہ ہوتا تو خام رہ جاتا
طبیعت آپ پہ آئی غلو بندگی آئی
جنوں سر شربت بشر میں نہیں تو کیوں آئی
تھنا پکڑ کے گریبانِ زندگی آئی
چمن میں گر یہ شب بزم غلط سہی لیکن
سوال یہ کہ پھولوں کو کیوں مہنی آئی
کسی کا وعدہ فردا ارے معاذ اللہ
جھپک جھپک کے ستاروں میں روشنی آئی
نہ مجھ سے خوش نظر آتے ہیں نہ کچھ ناراض

بڑے عذاب میں احسانِ زندگی آئی
میرے اشکِ غم کی تابانی بڑاتے جانیے
کس لیے بچنے کی زحمت ہونگا ہست
مُسکراتے جانیے، ہاں مسکراتے جانیے
سا منے جو آئے، دیوانہ بناتے جانیے
ہاں اسی زقار سے نزدیک آتے جانیے
میری آنکھوں کے چراغوں کو بجھاتے جانیے
زخم کھاتے جانیے، اور مُسکراتے جانیے
آپ اگر تشریف لیجاتے ہیں لیجائیں مگر
اے معاذ اللہ مری مجبویوں کی زندگی
عمر ہو جائے گی آسمانِ لکے دن یونہی تمام
دوست بنتے جاتیے، دشمن بناتے جانیے

سادھو کی چتا

ہنشنیں کشمیر سے لاہور کو آتے ہوئے
اک سماں دیکھا جگر پریش غم کھاتے ہوئے
گر چکا تھا طاقِ مغرب سے چراغِ آفتاب
بند تھی خیزدانِ تاریکی میں فطرت کی کتاب
ظلمتیں گردوں کی کالی جیل سے چھلکی ہوئی
جھکڑوں سے ٹہنیوں کی گردنیں ٹھلکی ہوئی

لحظہ لحظہ تیرہ تر ہوتی فضاؤں سرگیں
ابر کے دامن میں کندہ کی لپک چشموں کا شو
دور وادی میں کہیں مدھم سادہ تھا نور کا
پل کی اک دیوار کے نیچے قریب رہ گزر
بوندیوں میں آگ کا پرتو، چٹانوں جھلک
آگ کے خونخوار جیڑوں سو دھواں اٹھتا ہوا
ہر طرف بھیگے ہوئے پیڑوں کے پتے سو گوا
کھولتا سینہ، سلگتی کھوپڑی، پکتا بدن
ٹوٹی بنفیس، چٹختی ہڈیاں، اڑتے شر
ہوکتے جھونکوں آگے، چونکتی جنگاریاں

ہر طرف لہرا رہا تھا بے ثباتی کا علم
موت کی دیوی کے خونیں قہقہوں کا زیروہم

میرے قصر زندگی میں زلزلہ سا آگیا
بزمِ عشرت اٹھ گئی طنبوِ غم بجے لگا
عبرت اٹھی، آرزو بیٹھی، تمنا سو گئی
رات بھر میرے دل محروں کو بتیابی رہا

روح کے آئینہ خالی میں مٹھکا چھا گیا
ضربتِ تشویش سے سازِ الم بھنے لگا
یاس نے انگڑائی لی، امید زخمی ہوئی
خواب پر غالب پریشانی سے بخوابی رہی

اب بھی وہ منظر کبھی حبیب یاد آتا ہے مجھے
زندگی میں موت کا نقشہ دکھاتا ہے مجھے

آختر شیرانی

۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء



اختر شیرانی

نہ بھول کر بھی تمناؤں رنگ دبو کرتے
 چمن کے پھول اگر تیری آرزو کرتے !
 مسرت ! آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں !
 زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے !
 ایامِ بادِ میں اکروغ خود چھلک پڑتا
 مگر اُس کے رند ذرا اوڑھاؤ ہو کرتے !
 انھیں مغرور تھا اقرارِ عشق سے ، لیکن
 جیسا کہ منہ بھتی کو بی پاس ابرو کرتے !
 جنابِ شیخ پہنچ جاتے حرمِ کوثر تک
 اگر شراب سے میخانے میں دمنو کرتے
 پکارا اٹھتا وہ اکھروں کی دھڑکن میں
 ہم اپنے سینوں میں مگر اُسکی جستجو کرتے
 جنونِ عشق کی تاثیر تو یہ محض اختر
 کہ ہم نہیں دے خود اظہارِ آرزو کرتے !

شمس شیرانی

دیاست رامپور۔

اختر شیرانی

سرگزشت

اختر خاں نام، اور اختر تخلص ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی اور دادا کا نام محمد اسماعیل خاں شیرانی ہے۔

پروفیسر شیرانی، جن کی تنقیدی نظر مستشرقین یورپ سے حسرت علی تحسین حاصل کر چکی ہے، ۱۹۱۹ء میں ٹونک چھوڑ کر لاہور چلے آئے تھے۔ یہیں اختر نے ہوش سنبھالا اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہو کر منشی فاضل پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کی ڈگری لی۔ اس کے بعد رسالہ ہمایوں کی ادارت میں شریک ہو گئے۔ پھر ایک دوست کے کہنے پر ”بھارتی“ نکالا۔ کچھ عرصے کے بعد جنونِ عشق کے ہاتھوں اُسے بھی خیرباد کہدیا۔ چند سال بعد اورینٹل کالج سے میٹرک میں بھی شریک ہوئے۔

شعرد شاعری سے اختر کو فطری لگاؤ ہے اور لڑکپن سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدا میں اپنے اتالیق صابر علی خاں شاکر سے کچھ دن مشورہ کیا تھا۔ بعد ازاں ذوقِ فطری سے مدد لیتے رہے، اور رفتہ رفتہ

اُردو کے ممتاز شاعروں میں گئے جانے لگے۔

اختر کا درمیانی قد، اور سانولا رنگ ہے۔ پیشانی کشادہ، چہرہ آفتابی اور آواز میں دلکشی ہے، لیکن کسی مشاعرے میں محن و ترنم کے ساتھ کلام نہیں پڑھتے۔

طبیعت میں شوخی اور رنگینی ہے، اور مناظر قدرت سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اہل مذاق کے یارِ شاطر ہیں، اور پُر خلوص محبت کرتے ہیں۔ بے حد بے پروا اور بے باک واقع ہوئے ہیں۔ نہ کسی پابندی سے نظم کرتے ہیں، اور نہ کسی مجبوری سے شعر لکھتے ہیں۔ ان کے خیالات منشور اور جذبات منظوم سود و زیاں کی نیازمند نہ قیود سے آزاد ہیں۔

اقسامِ شاعری کے متعلق حسبِ ذیل اظہارِ خیال کیا ہے :-
”شعر سے تو بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں، لیکن میرے نزدیک شاعری ایک وہ جذبہ ہے، جو عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور اُمحیوں کے لیے باعثِ مسرت ہیں۔ میں جذباتی شاعر ہوں اور اِسی قسم کے اشعار کہنا پسند کرتا ہوں“

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ اول ”اُردو“ مدارس میں لازمی کی جائے، دوسرے اُردو پڑھنے والے زیادہ پیدا کیے جائیں اور تیسرے اچھے مصنفین کی قدر کی جائے۔

ان کے نزدیک اُردو میں ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے شمول میں مضائقہ نہیں جن سے ہماری زبان کی فصاحت، موسیقی اور لطافت میں فرق نہ آئے۔

ردیف و قافیہ کی پابندی میں چونکہ ایک ناقابلِ بیان موسیقی اور

تاثیر ہے، اس لیے اشعار میں ان کا ہونا لازم جانتے ہیں۔

دیگر شعرا کے یہ اشعار ان کو پسند ہیں :-

ساعدیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑو بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیال خاتم
کیفیت ختم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لے کر چلا میں
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے، انداز تو دیکھو ہے بوالہوسوں پر بھی ستم، ناز تو دیکھو
تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط، الفت، وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا
جس لوہ دیکھا تری رعنائی کا کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
جھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں اکہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
مجھے اٹھانے کو آیا ہے واعظ ناداں اٹھا سکے تو مرا ساغر شراب اٹھنا
ان کا خیال ہے کہ نظموں کی ابھی ابتدا ہے، اس لیے آگے چل کر
کوئی ایسا شاعر پیدا ہوگا جس کو ”استاد“ کہا جاسکے۔ غزل میں تمیر،
درد، داغ، مولانا حسرت، اور جگر کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ان کے منظوم کلام کے حسب ذیل مجموعے طبع ہو چکے ہیں :-

(۱) پھولوں کا گیت۔ (بچوں کے لیے)،

(۲) نغمہ حرم (عورتوں کے لیے)،

(۳) صبح بہار (عام نظموں کا مجموعہ)۔

آج کل انجمن ترقی اردو کا کچھ کام اپنے وطن (ٹونک) میں کر رہے

ہیں۔

انتخابِ کلام

اُس کے عہدِ شباب میں جینا
جینے والوں تمھیں ہوا کیا ہے
خویریں نیکوں میں بٹ چکی ہوئی
بارِغِ رضواں میں اب کھ گیا ہے
اک محبت تھی مٹ چکی یارب
تیری دُنیا میں اب کھا گیا ہے

بُھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی
پارسانی کی جواں مرگی نہ چھوڑ
تو بہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی
سازِ دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آ گئی

مستانہ پیے جا، یوں ہی مستانہ پیے جا
پیمانہ تو کیا چیز ہے مینخانہ پیے جا
کشکول ہو یا ساغرِ حُج، نشہ ہر کیساں
شامانہ پیے جا کہ فقیرانہ پیے جا
کر غرقِ می و جامِ غم گردشِ ایام
ہاں اسے دلِ ناکام کھیمانہ پیے جا

او! دیس سے آنے والے بتا!
کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟
او! دیس سے آنے والے بتا
کس رنگ میں ہر کنتانِ وطن؟
آوارہ غربت کو بھی سنا
وہ بارِغِ وطن فردوسِ وطن؟
او! دیس سے آنے والے بتا
وہ سرِ وطنِ ریحانِ وطن؟

اوا دلیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں
کیا اب بھی وہاں کے پرہت پر
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں

مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
ویسے ہی دلوں کو بُھاتی ہیں؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی
کیا اب بھی سہانی راتوں کو
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے

سرست نظارے ہوتے ہیں؟
وہ چاند ستارے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی شفق کے سایوں میں
کیا اب بھی چین میں ویسے ہی
برساتی ہوا کی لہروں سے

دن رات کے دامن ملتے ہیں؟
خوش رنگ ننگوں نے کھلتے ہیں؟
بھیکے ہوئے پردے بہتے ہیں؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا

۱۰۰ ۳۱۶

معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
پھولوں کے گندھی ہاں اب کہ نہیں؟

شاداب و شگفتہ پھولوں سے
بازار میں مالین لاتی ہے

اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں
نوخیز خریدار

او! دلیس سے

او! دلیس سے آنے والے بتا

کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی
دکھپ اندھ
اور گلیوں کی دُھندلی شمعوں پر
سایوں کا
باغوں کی گھنیری شاخوں میں
جس طرح

او! دلیس سے

او! دلیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں ویسے ہی خواں
اور مدھ بھرا
کیا رات بھرا اب بھی گیتوں کی
اور پیار کی
وہ حُسن کے حباد و چلتے ہیں
وہ عشق کی گھ

او! دلیس سے

او! دلیس سے آنے والے بتا

ویرانیوں کے آغوش میں وہ
آباد ہے بازار
تلواریں بے نل میں دایئے ہوئے
پھرتے ہیں طرح
اور ہیلیوں میں سے جھانکتے ہیں
ترکانِ سیہ

او! دلیس سے آ

او! دلیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی ممکنے مندر سے
ناقوس کی آوا

کیا اب بھی مقدس مسجد پر
اور شام کے رنگیں سایوں پر
مستانہ ازاں تھراتی ہے؟
اک عظمت سی چھا جاتی ہے؟
اوادیس سے آنے والے بتا

اوادیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے
پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟
ماٹھے پر گاجر دھرتی ہیں؟
ہنستے ہوئے چہلیں کرتی ہیں؟
اوادیس سے آنے والے بتا

اوادیس سے آنے والے بتا
برسات کے موسم اب بھی وہاں
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں
اور دور کہیں کچھ دیکھتے ہی
ویسے ہی سہانے ہوتے ہیں؟
جھولے اور گانے ہوتے ہیں؟
نوعمر و دانے ہوتے ہیں؟
اوادیس سے آنے والے بتا

اوادیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پہاڑی چوٹیوں پر
کیا اب بھی ہوائے ساحل کے
کیا اب کیا کی اونچی ٹیسری پر
برسات کے بادل چھاتے ہیں؟
وہ رس بھرے جھونکے آتے ہیں؟
لوگ اب بھی وہ پیشے گاتے ہیں؟
اوادیس سے آنے والے بتا

اوا دلیں سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پہاڑی گھاسیٹوں میں
ساحل کے گھیرے پیڑوں میں
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں

گھنگھور گھٹائیں گونجستی ہیں؟
برکھا کی ہوائیں گونجستی ہیں؟
موروں کی صدائیں گونجستی ہیں؟
اوا دلیں سے آنے والے بتا

اوا دلیں سے آنے والے بتا
کیا نوگرنے کے میلوں میں وہی
پھیلی ہوئی بڑکی شاخوں میں
اُڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں

برسات کا جوبن ہوتا ہے؟
جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟
چھایا ہوا ساون ہوتا ہے؟
اوا دلیں سے آنے والے بتا

اوا دلیں سے آنے والے بتا
کیا شہر کے گرداب بھی ہیں رواں
جوں گود میں اپنے من کو لیے
یا نور کی ہنسلی حور کی گردن

دریاے حسیں لہراے ہوئے؟
ناگن ہو کوئی ٹھہراے ہوئے؟
میں ہو عیاں بل کھاے ہوئے؟
اوا دلیں سے آنے والے بتا

اوا دلیں سے آنے والے بتا
کیا اب بھی فضا کے دامن میں
کیا اب بھی کنارِ دریا پر

برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟
طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟

کیا اب بھی اندھیری راتوں میں

ملاح ترانے گاتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں برسات کے دن
معصوم حسیں دوشیزائیں
اور ستروں کی طرح سر

باغوں میں بسا رہی آتی ہیں؟
برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
زنگیں جھولوں پر لہرائی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی اُفق کے سینے پر
دریا کے کنارے باغوں میں
اور اُن کے نشیلے جھونکوں سے

شاداب گھٹائیں جھومتی ہیں؟
مُحسور ہوائیں جھومتی ہیں؟
خاموش فضا تیں جھومتی ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی شام کو جاتے ہیں
وہ پیر گھنیرے اب بھی ہیں
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے

احباب کنارِ دریا پر؟
شاداب کنارِ دریا پر؟
مستاب کنارِ دریا پر؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا آم کے اونچے پیڑوں کے

اب بھی وہ پیسے بولتے ہیں؟

نعموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
تالاب میں ام رس کھولتے ہیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

شاخوں کے حریری پردوں میں
ساون کے رسیلے گیتوں سے

وہ مدر سے کی شاداب فضا؟
جس میں وہ مثالِ خواب فضا
وہ خواب گر متاب فضا
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں
وہ کھیل، وہ ہم سن، وہ میلاں

باقی ہے ہماری چاہ؟ بتا
اب یاروں میں کوئی آہ؟ بتا
بُدا! بتا، بُدا! بتا
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے
او! دیس سے آنے والے بتا

مستانہ فضا میں بھول گئیں؟
سادن کی گھٹائیں بھول گئیں؟
جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟
او! دیس سے آنے والے بتا

او! دیس سے آنے والے بتا
کیا ہم کو وطن کے باغوں کی
برکھا کی ہساریں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے؟

او! دلیں سے آنے والے بتا
کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی
دیہات کی کم سن ماہوشیں
اور چاند کی سادہ روشنی ہیں

مستی بھری راتیں آتی ہیں؟
تالاب کی جانب جاتی ہیں؟
زنگین ترانے گاتی ہیں؟
او! دلیں سے آنے والے بتا

او! دلیں سے آنے والے بتا
کیا اب بھی گجر دم چرواہے
اور شام کو دھندلے سایوں کے
اور اپنی ریلی بانسریوں

ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں؟
ہمسراہ گھروں کو آتے ہیں؟
میں عشق کے نغمے گاتے ہیں؟
او! دلیں سے آنے والے بتا

او! دلیں سے آنے والے بتا
کیا بھانجی پہ اب بھی ساون ہیں
معصوم گھروں سے بھور پھٹے
اور یاد میں اپنے میکے کی

برکھا کی ہباریں چھاتی ہیں؟
چکلی کی صدائیں آتی ہیں؟
بچھڑی ہوئی سکیمیاں گاتی ہیں؟
او! دلیں سے آنے والے بتا

او! دلیں سے آنے والے بتا
گکراج کا خواب آلودہ سا گھاٹ
وہ باغ، وہ بنگلہ، وہ تالاب

اور اُس کی فضا میں کیسی ہیں؟
اور اُس کی ہوائیں کیسی ہیں؟

اور اُن کی صدائیں کیسی ہیں؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

وہ کھیت، وہ گاؤں، وہ پڑیاں

تایخ کی عسرت طاری ہے؟
مایوسی و حسرت طاری ہے؟
ویرانی و رقت طاری ہے؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی پُرانے کھنڈروں پر
ان پُرنا کے اُجڑے مندر پر
سنان گھروں پر چھاؤنی کے

وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی
ہم دونوں تھے جس کے پروانے

وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے؟
وہ جانِ وطن کس حال میں ہے؟
وہ بیم بدن کس حال میں ہے؟
اوا دلیس سے آنے والے بتا

اوا دلیس سے آنے والے بتا
مرجانہ تھسا جس کا نام، بتا
جس پر تھے فدا طفلانِ وطن
وہ سروِ چمن، وہ رشکِ سمن

جنت کے نظارے روشن ہیں؟

اوا دلیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی رُخِ گلرنگ پر وہ

ساون کے ستارے روشن ہیں؟
بجلی کے شرارے روشن ہیں؟
اوا دلیں سے آنے والے بتا

کیا اب بھی رسیلی آنکھوں میں
اور اُس کے گلابی ہونٹوں پر

اوا دلیں سے آنے والے بتا

گیسے سیبل کھاتے ہیں؟
دو ناگ پڑے لہراتے ہیں؟
راتوں کے سے پھنے آتے ہیں
اوا دلیں سے آنے والے بتا

کیا اب بھی شہابی عارض پر
یا بحیرہ شفق کی موجوں پر
ادرجن کی جھلک سے ساون کی

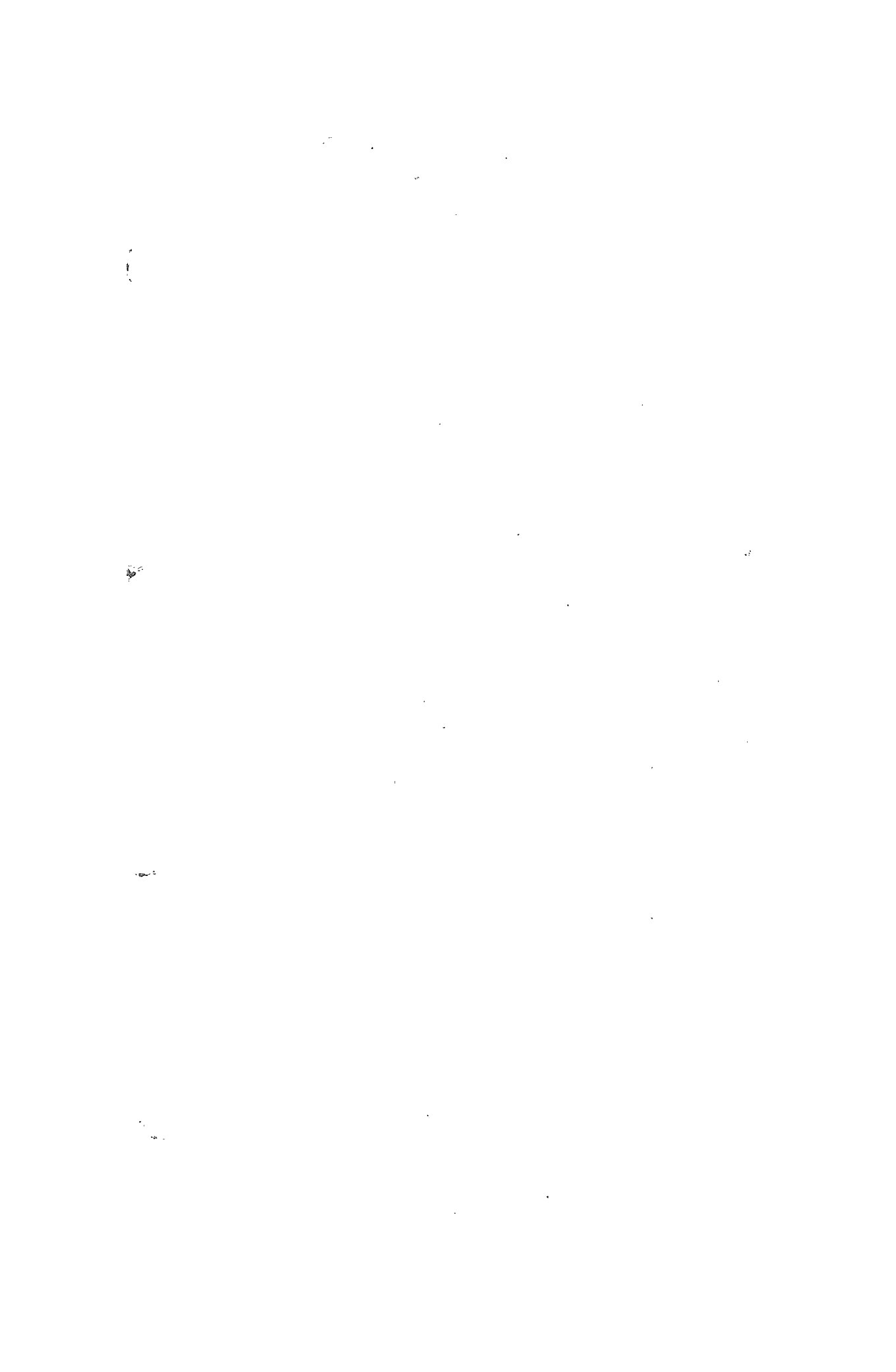
اوا دلیں سے آنے والے بتا

میکے میں ہے، یا سسرال گئی؟
کبکھت جوانی ڈال گئی؟
خوش حال رہی، خوش حال گئی؟
اوا دلیں سے آنے والے بتا

اب نام خدا ہوگی وہ جواں
دوشیزہ ہے، یا آفت میں اُسے
گھر پر ہی رہی، یا گھر سے گئی؟

ایمنِ غری

۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء





امین حزین

غزل

بے بسی اختیار کیا جانے! زرد پٹی بہا کر کیا جانے!
 شام جو ہو چکی ہو خاک نشیں شہریت پرگ و بار کیا جانے!
 تار تار اس کا چھپر لٹکے ہوئے حرفِ مکتوب سن کر کیا جانے!
 رتنے آنسو بیاں سے آنے ہیں دیدہ اشکبار کیا جانے!
 مشرق کے پائے دشتِ پامیں آجے ہیوں ہیں؟ خار کیا جانے!
 غنچہ لبِ اسیر بھاریں لقمہٴ نوبہار کیا جانے!

خود دہری کا مقام ہے یہ آپس

خود فرہی و قار کیا جانے

محمد علی حسین
 حسین حسین
 تعلیم خود

تہنم رامپور کٹیٹ

23.12.1941

ایمن خزیں

سرگزشت

خواجہ محمد سیح پال نام، ایمن خزیں تخلص، سال پیدائش ۱۸۸۴ء، مقام ولادت سیالکوٹ، اور والد کا نام مولوی احمد دین ہے۔

ایمن خزیں نے عربی و فارسی شمس العلماء مولوی امیر حسن (مستاد علامہ اقبال) سے پڑھی، اور انگریزی کی تعلیم اول مشن ہائی اسکول اور بعدہ مشن کالج سیالکوٹ میں پائی۔

پہلے ڈاکٹر بننے کا شوق ہوا، لیکن سائنس سے طبیعت کو مناسبت نہ تھی، اس لیے ملازمت کر لی۔ کچھ عرصہ ہوا کہ انڈین اسٹنٹ پولیسکل ایجنسی گلگت سے خان بہادر کا خطاب لے کر فیشن پائی ہے۔

ملازمت کے دوران میں بھی علمی مشاغل برابر جاری رہے۔ اب ہم تن اردو ادبیات کی خدمت میں مصروف ہیں۔

شعر و سخن کی طرف طبیعت کا رجحان ابتداء ہی سے تھا، لیکن ۱۹۶۳ء سے یہ مشغلہ برابر جاری ہے۔

ابتداءے شعر گوئی میں مولوی نطفہ علی خاں اور مولانا محمد علی چوہدر

مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے۔ بعد ازاں علامہ اقبال کو پسند کرنے لگے، اور یہ رنگ کچھ ایسا بھایا کہ پھر کسی کا نقشہ نہ جم سکا۔
 امین حزیں متوسط قیامت، پُرگوشت اور گورے رنگ کے خوبصورت انسان ہیں، کشادہ پیشانی سے فراخی حوصلہ، بلند خیالی اور خوش اخلاقی ٹپکتی ہے، اور باتوں سے عالی ہمتی، قلب کی صفائی اور فکر کی گہرائی کا پتا چلتا ہے۔

ان کے کلام کو گل و بلبل، یللی و محنوں، وامق و عذرا، اور شبِ ہجراں کے افسانہ بارے دراز سے دُور کا تعلق بھی نہیں۔ یہ اصلاحی، اخلاقی اور خطیبانہ شاعری کے علم بردار ہیں۔

اُردو زبان کی ترقی و توسیع کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ بلند پایہ علمی اور اخلاقی کتابوں کے بکثرت ترجمے کیے جائیں اور مستقل کتابیں، مفید اور دلچسپ مضامین پر لکھی جائیں، نیز قدرتی زبان اور لطافتِ شاعرانہ کے ساتھ موثر انداز میں پاکیزہ اور بلند خیالات نظم کرنے کی اہلیت پیدا کر لی جائے، تو اُردو کو دہی شرف حاصل ہو سکتا ہے، جو دیگر ترقی یافتہ زبانیں پا چکی ہیں۔

ہندی اور سنسکرت کے ساتھ جملہ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اُردو زبان میں شامل کیے جانے کے حامی ہیں، بشرطیکہ وہ غیر الفاظِ ترکیب سے استعمال کیے جائیں کہ ان کو اپنا لیا جاسکے۔

ردیف و قافیہ کی پابندی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ موجودہ

شاعر توجہ سے کام نہیں لیتے اور انگریزی شاعری کے اتباع میں ردیف و قافیہ کی پابندی سے گریز کرتے ہیں، حالانکہ اس قسم کی

شاعری ہے۔ ایشیائی شاعری میں ردیف و قافیہ کی
ی ہے۔ جب تک ردیف و قافیہ نہ ہوگا، موسیقیت
لمتی، جو ایشیائی شاعری کا جزو لاینفک ہے۔

انہ کے چند پسندیدہ اشعار کے سلسلے میں ظاہر کیا کہ
اقبال کا کل کلام پسند ہے اور برجستہ یہ شعر پڑھا۔
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال کو اور غزل میں میرزا غالب کو استاد
ن کے کلام کا ایک مجموعہ ”گلبنگ جیات“ کے نام

انتخابِ کلام

مرد مومن کی شان پیدا کر اے کفِ خاکِ جان پیدا کر
ہے خطابِ تَخَلُّقِ اُکس سے آپ اپنا جان پیدا کر

پردگی موت ہو شہود ہو زلیست جو ہر پاک کی نمود ہو زلیست
ہر شجر کی زبانِ حال سے سُن روز و شب مائلِ صعود ہو زلیست

جس میں بتیابی نمود نہیں زلیست وہ درخورِ شہود نہیں
اس کی بود و نبود اس کا عمل زندگی کا کوئی وجود نہیں

لاپے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام جن میں ہو کیفِ زندگی بہرِ خدا وہ کام کم
طورِ حیات سے اڑا، جذبہِ بستی کی آگ جب کہیں جا کے نیتِ زندگی دو اکم
پہلے یہ سچ دم کے توڑ ٹکی سکتا بھی بعد کو دل میں خواہشِ انا نہ زیرِ دم
تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی کائنات بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کم
حیف سمجھ رہا ہے تو اپنی جھجک کو قتب میکہدہ حیات میں شوق سے مہِ بجام کم
نقشِ نوی نہیں ہے تو صفحہِ روزگار پر مٹنے سے گرنے میں مفرط ہی اپنا نام کم

بندہ خواہشات کو کتنا ہے کون عبدِ حر
چاہیے حریت اگر دل کو آئیں غلامِ کمر

یوں دل ہے سرسجدہ کسی کو حضور میں
ہنس ہنس کے کہ رہی ہچکن کی کلی کلی
ساقی نگاہِ مست سے دیتا ہے جب کبھی
کھائیں جاکشیشِ فریبِ قیاس و وہم
مثلِ کلیم کون سُنے لن ترائیاں
میش از دو حرف اپنی نہیں استانِ در
جیسے کہ غوطہ زن ہو کوئی بحرِ نور میں
آتا ہے لطفِ حُسن کو اپنے ظہور میں
گتے ہیں چار چاند ہمارے سرور میں
یہ کیفِ جاں نواز کہاں چشمِ حور میں
میرے یکے کشش ہی کہاں کوہِ طور میں
ہم گر کے آسمان سے اٹکے کھجور میں

یہ شوخیاں کلام میں یونہی نہیں، امیں

پڑھنے چلے ہیں آپ غزلِ رام پور میں

افسانہٴ حیات کو دہرا رہا ہوں میں
اک اک قدم پہ درسِ وفادیر ہا ہوں میں
یار کسی کا دامِ حسینِ منتظر نہ ہو
اس سحرِ رنگ و بونے تو دیوانہ کر دیا
سویدِ درونِ سینہ کو نغموں میں ٹھہال کر
راہِ طلب میں دیکھ مرے دل کی حسرتیں
یوں اپنی عمر رفتہ کو لوٹا رہا ہوں میں
کیس کی جستجو ہے کدھر جا رہا ہوں میں
پر شوق کے لگے ہیں اڑا جا رہا ہوں میں
دامن کے تار تار کو ابھار رہا ہوں میں
سازِ نفس کے تار کو بر مار رہا ہوں میں
سایے میں پائے خضر کو سہارا رہا ہوں میں

رستے کی امیجِ پنج سے واقف تو ہوں امیں

ٹھوکر قدم قدم پہ مگر کھار رہا ہوں میں

ناز ہی کیا نیاز مندوں کا
بندگی ہے شعارِ بندوں کا
جس طرح مے خمار کا ہے علاج
دردِ درماں ہو دردِ مندوں کا
ہر حسینِ پیسر کا ہوں گرویدہ
کیا ہی کسامری پسندوں کا

زندگی میں فراغ ناممکن زندگی سلسلہ ہر دھندوں کا
دل کی خود داریوں کی خیریں دور دورہ ہر خود پسندوں کا
بلبلو! باغ میں تمہیں ہر ہدف غنچہ و گل کے ریشخندوں کا

تو الہوس کی آئیں بلا جانے
عشق مسلک ہے درد مندوں کا

نور رنگ و بونے مار ڈالا اسی کی آرزو نے مار ڈالا
نہ دنیا ہی کا رکھا اور نہ دیں کا دل مدہوش تو نے مار ڈالا
تنگم کا فسوں، اللہ اکبر! کسی کی گفتگو نے مار ڈالا
نہ رواد و حبابِ زندگی پوچھ خرامِ آب چونے مار ڈالا
خدا و اعظ سے سمجھے حشر کے دن ہمیں اس بے وضو نے مار ڈالا

زمانے کے آئیں منہ کون آتا

خیال آہرو نے مار ڈالا

مال ہے یہ تری اپنی کم نگاہی کا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز زر نظر آئے
وہ دل کہاں تیشِ دل گداز سچا کہ جس کی آنکھ کو جگنو شر نظر آئے

محبت کی کہانی دروسِ خالی نہیں ہوتی گلِ اس پر ہونوں بنجارِ ڈی الی نہیں ہوتی
جنونِ عشقِ مشقِ چاکِ امانی نہیں کرتا اتیں جب تک تمناؤں کی پامالی نہیں ہوتی

حیاتِ رزم ہو نرم ربابِ جنگ نہیں سرورِ آتش سیالِ کیفِ جنگ نہیں

فضائے دہریہ پر دوا ز شور سے کرنا حیات شہیر پر دوا ہے پتنگ نہیں

تلاشِ عیشِ جہاں مقصدِ حیات نہیں سرود و رقص کی محفل یہ کائنات نہیں
مدارِ زیستِ آس، جدوجہدِ پیہم ہے حیاتِ روزِ وغا، شبِ برات نہیں

پکڑ صراحی کو گردن سے قیل و قال نہ کر اگر یہ ٹوٹ بھی جائے، تو کچھ ملال نہ کر
محال ہے کہ ترا ظرفِ تشنہ کام ہے خودی کا ہاتھ بڑھا خود اٹھا سوال نہ کر

مثلثِ معنوی

رہے بنیا سفر میں اور حضر میں پڑے چہرے پہ، اگر گڑ جائے جگر میں
حقیقت کو سمجھ لے اک نظر میں دکھائی دے جسے قطرہ گہر میں

عطا یا رب مجھے ایسی نظر ہو

جسے سختی نہ سمجائے وہ دل دے جو مشکل میں نہ گھبرائے وہ دل دے
جو روئے اور نہ چلائے وہ دل دے دو عالم سے جو بھڑ جائے وہ دل دے

کسی کا خوف ہو جس کو نہ ڈر ہو

مثلثِ معنوی - مثلثِ ہلکی قسم کی شرابِ انگور - آپ انگور کو

آپخ دے کر تھوڑا سا خشک کر لیا جاتا ہے۔ اس عمل سے آپخ
دیا ہوا آپ انگور کسی حد تک نشہ آور بن جاتا ہے، جسے اہل
ایران مثلث یا مثلثِ شرعی کہتے ہیں۔

نقابِ جلوہ مستور یعنی سراپا سوزِ شمع طور یعنی

جنابِ عشق کا مامور یعنی حریفِ قیصر و مغفور یعنی

مرا، یارب! جگر، ایسا جگر ہو

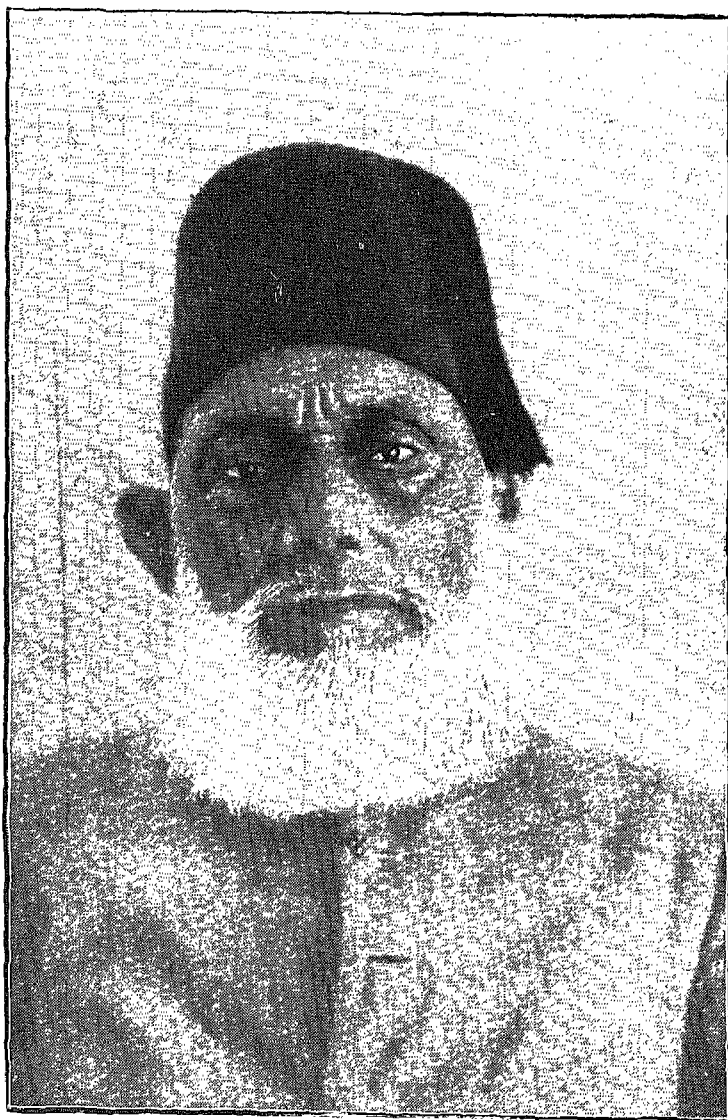
وہ بندہ کیوں نہ شمشیرِ خدا ہو نہ کیوں آپ اپنا وہ شکستہ

وہ فطرت پر نہ کیوں فرمانروا ہو جسے جامِ ملت یہ عطا ہو

نظر ہو جس میں دل ہو اور جگر ہو

بخوددستی

۲۳ مایچ ۱۹۴۱ء



بيخود دهلوی

نزع میں آگ ہو رہی ہے

صوت کو گھونٹ کر دیا ہے

کوئی دہائی بھی دیکھا کوئی

یوں لگے کہ تری تری میں دیا ہے

میں نے دیکھا ہے

۲۲/۱۱/۱۹

مہمان خانہ سرگرمی واپس

1

2

3

4

سرگزشت

سید وحید الدین احمد نام، بیچود تخلص، والد کا نام سید شمس الدین احمد، دادا کا سید بدرالدین احمد کاشف، اور پردادا کا نواب سید امیر احمد خاں بہادر تھا۔ یہ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے۔ سلسلہ نسب سلطان العارفین حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ سے بائیسویں پشت میں ملتا ہے۔

بیچود بھرت پور میں پیدا ہوئے، ۳۰ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ تاریخ ولادت ہے۔ دو ماہ بعد ان کے والد مع اہل و عیال دہلی چلے آئے۔ چار سال کی عمر سے دہلی میں اردو فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے ملک کے مشہور ادیب حضرت علامہ خواجہ الطاف حسین حالی جیسے استاد ملے۔ گھر میں ایک مایہ ناز ادیب ”مریم زمانی بیگم“ کے آغوش تربیت میں لال قلعے کی نکالی اردو بولنے اور لکھنے کا فخر حاصل ہوا۔

شعر گوئی خاندانی مشغلہ تھا۔ اس لیے بچپن ہی سے طبیعت کا

اکثر رام پور آنے اور رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔
انہیں دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں :-

انشا نہ چھڑائے محبت بادِ بہاری، راہ لگ اپنی

تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ اک عمر چاہیے کہ گوارا ہوشِ عیش

رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟

حالِ نشاطِ نغمے ڈھونڈتے ہو اب

آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں؟

مینا نے کے قریب تھی مسجد بھلے کو دل

ہر ایک پوچھتا تھا کہ "حضرتِ ادھر کہاں؟"

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں -

"ادھر جاتا ہے دیکھیں، یاد دہر پر دانہ آتا ہے"

دمِ فریادِ نالے خلق میں چھریاں چھوتے ہیں

زباں تک ٹکڑے ہو ہو کر مرے افسانہ آتا ہو

ہجر کی یہ رات کیسی رات ہے

ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے

انتخابِ کلام

اُٹھے تری محفل سے تو کس کام کے اُٹھے
دل تھام کے بیٹھے تھے جگر تھام کے اُٹھے
دم بھر مرے پہلو میں اُنھیں چن کہاں سے
بیٹھے کہ بہانے سے کسی کام کے اُٹھے
افسوس سے اغیار نے کیا کیا نہ ملواتھ
وہ بزم سے جب ہاتھ مرا تھام کے اُٹھے
دنیا میں کسی نے بھی یہ دیکھی نہ نزاکت
اُن سے نہ کبھی حرف مرے نام کے اُٹھے
جو ظلم و ستم تم نے کیے سب وہ اُٹھائے
اک رنج و الم ہم سے نہ الزام کے اُٹھے
صدے تو بہت قیدیں جھیلے مرے دل
جھٹکے نہ مگر زلفِ سیہ قام کے اُٹھے
ہو رشک کہ یہ بھی کہیں شیدانہ ہوں سکے
تربت سے بہت لوگ مے نام کے اُٹھے
افسانہ حسن اس کا ہو ہر ایک نے باں پر
پردے نہ کبھی جس کے درِ بام کے اُٹھے
آغازِ محبت میں مرے دل نے اُٹھائے
پوچھے تو کوئی رنج بھی انجبا م کے اُٹھے

دل نذر میں دے آئے ہم اُس شوخ کو بخود
باز اریں حبیبِ دام نہ اس جام کے اُٹھے

ارمان اگر نکلے، ارمان کا کیا کہنا
احسان کرو دل پر احسان کا کیا کہنا
معشوق سہی پر یاں، مشہو سہی جو رہا
انسان کی کیا نسبت، انسان کا کیا کہنا
اِس بات کی ضد کیسی جو سن نہ سکے کوئی
ارمان ہی چٹھ اُن کی، ارمان کا کیا کہنا
پوشیدہ ربا دل میں اللہ سے ترا پر د
ہر شے سے نظر آیا، اِس شان کا کیا کہنا
ہو جان کا غم زاہد اُس بہت کی محبت میں
ایمان سلامت ہے ایمان کا کیا کہنا
خط میں مجھے لکھا ہے دشمن ہو جا کر
قسمت کا نوشتہ ہے فرمان کا کیا کہنا

کیا بات ہو اُس دل کی جس میں تو سما جا
 قربان ہو جو تجھ پر اُس جان کا کیا کہنا
 چٹکی میں ہی تیرا تک چٹکی سے نہیں چٹا
 آنکھوں میں کھٹکتا ہے، پیکان کا کیا کہنا
 بخود کی خوشی سے گم ہوش ہیں قاتل کے

قدموں ہی پہ دم توڑا اوسان کا کیا کہنا

سراپا درد ہوں بیدار دیر چس دن سے مائل ہوں

مری فریاد سے ڈرنا کہ میں لٹٹا ہوا دل ہوں

تصور اپنا ہوں دل سے نکلنے کے لیے تیرے

تزی محفل میں آکر بیٹھ جانے کے لیے دل ہوں

مزے سے شرم عصیاں کے، اگر آگاہ ہو جائے

تمنا ہو یہ زاہد کو، گنگاروں میں داخل ہوں

خدا جانے جوانی کی طرح پھر میں کہ صر جاؤں

تغاقب میں رواں، عمر رواں کے چند منزل ہوں

خیال گیسوے پر خم سے وحشت کام لیتی ہے

مری دیوانگی دیکھو کہ پاسبند سلاسل ہوں

مجھے مطلب، کردوں ناصح سے حجت، اُس کو بکنے دو

کوئی دیوانہ ہوں، نادان ہوں، یا میں بھی جاہل ہوں

بقول حضرت استاد کس گنتی میں ہوں بخود

کسی فن میں نہ لائق ہوں، نہ فائق ہوں، نہ کامل ہوں

غمِ اُلفت سے دل لاکھوں پریشاں ہوتے جاتے ہیں
 یہ گھر آباد ہو جانے سے ویراں ہوتے جاتے ہیں
 یہ میری بکیسی اور مجھ پہ احساں ہوتے جاتے ہیں
 کہ وہ کچھ خود بخود دل میں پشیاں ہوتے جاتے ہیں
 بجائے ناخن و حشت، مجھے درکار ہیں نشتر
 کہ اب تارِ گریباں بھی رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں
 جوانی میں سمجھ آتی ہے، ہم متائل نہیں اس کے
 کہ جتنی عمر بڑھتی ہے، وہ ناداں ہوتے جاتے ہیں
 خوشی ہو تو ہمدرد اور بڑھتی ہے کھٹکِ دل کی
 کریں کیا ضبطِ غم، لمبے بھی پیکاں ہوتے جاتے ہیں
 نگاہِ طعنت بھی تلوار کے ہمسراہ پڑتی ہے
 غضب یہ ہی، ستم کے ساتھ احساں ہوتے جاتے ہیں
 وہ دل ہی جب نہیں پہلو میں پھر پاس وفا کیسا؟
 ہمارے عقدہ دشوار آساں ہوتے جاتے ہیں
 نگاہیں جب لڑیں آپس میں، یہ بھی دیکھتے جاؤ
 عیاں کس کی نظر سے رازِ پنہاں ہوتے جاتے ہیں؟
 وہی ہم ہیں، وہی دل ہے، وہی اُن کی تنہا ہے
 نئے سرے اُنھیں باتوں کے ارماں ہوتے جاتے ہیں
 نہ دیکھے ہوں گے رنیدِ لالِ بالی تم نے بچو دے
 کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

غضب ہو اس تمنا سے وہ خواہش دل کی کرتے ہیں
 زمانہ جاتا ہے اُن کے دشمن مجھ پہ مرتے ہیں
 وہیں بیٹھے رہو بس دور ہی سے بات کرتے ہیں
 ستم کیسا تمہارے لطف سے بھی ہم تو ڈرتے ہیں
 تجھے بھی بیٹھے بیٹھے وہم کچھ ناصح گزرتے ہیں
 لیے مرتا ہے ہم کو مفت کیوں ہم کس پر مرتے ہیں
 کسی نے دل کو چھینا، جان کو جھپٹا، ستم ڈھایا
 تری نچی نگاہوں کے اشارے ظلم کرتے ہیں
 چُرا کر دل وہ کہتے ہیں کہ کرتی ہے بلا اپنی
 ہمیں کیا آپ کی چوری ہو؟ ہم کیا کوئی ڈرتے ہیں؟
 یہ کوئی بھید ہے، اس میں بھی کوئی راز مخفی ہے
 مراد دل دیکھ کر وہ اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہیں
 لب معجز نما چشمِ سخن گو، جھوٹے ہیں دونوں
 اشارے سے وہ پھرتی ہو، یہ وعدے مگر تے ہیں
 ہماری جان ہو کر جب جدا رہتے ہو تم ہم سے
 تو پھر کیا جھوٹ کہتے ہیں جو ہم کہتے ہیں مرتے ہیں؟
 تڑپا ہوا ہوتا ہوں دل کے ساتھ میں بھی مضطرب ہو کر
 تسلی کے لیے اس ناز سے وہ ہاتھ دھرتے ہیں

بچھالیں شمع کے دل کی لگی پروانے، جب جانیں
 یہ اپنی آگ میں جلتے ہیں، تو کیا گل کترتے ہیں
 نگاہیں جستجوئے غیر سے حنائی نہیں رہتیں
 نظر پر جب کوئی چڑھتا ہے ہم دل سے اُترتے ہیں
 جھجک کیسی، یہ خنجر پھیرنے سے پچھپا ناکیا؟
 نہ تڑپیں گے قسم لے لیجیے، کیوں آپ ڈرتے ہیں؟
 فدا ہیں ابروئے پر زخم پہ سیدھی بات تو یہ ہے
 بھریں گے زخم کیا ان کے جو دم خنجر کا بھرتے ہیں
 نزاکت سے رُکا خنجر، گلہ ہے سخت حنائی کا
 وہ اپنا بوجھ بھی گویا مری گردن پہ دھرتے ہیں
 مری شامت کہ میں نے اُن کو تصویریں دکھا دی تھیں
 وہ حسنِ لیلیٰ و شیریں پہ اب تک نام دھرتے ہیں
 نہ اپنے قول کے پورے، نہ اپنی بات کے چکے
 وہ رہ رہ کر پلٹتے ہیں۔ وہ کہہ کہہ کر گمرتے ہیں
 تمھارے منہ سے میں جس دم کسی کا نام سُنتا ہوں
 ہزاروں وہم آتے ہیں، ہزاروں شک گزرتے ہیں
 خدا سے ڈر ہو ہر اک بات پر ارشاد ہوتا ہے
 مجھے کیوں کر یقین آئے، خدا سے آپ ڈرتے ہیں؟
 سنبھل جائیں گے بچو د آ گیا ہے غش، نہ گھبراؤ
 بھلی تشویش کی تم نے، بھلا ایسے بھی مرتے ہیں

ہاتھ میں طاقت اگر اے ناز میں اتنی نہیں
 پھیر دے دل پر چھری، پسین جبین اتنی نہیں
 سچ تو یہ ہے، ماہ کی روشن جبین اتنی نہیں
 روشنی جو تیرے رخ میں ہے کہیں اتنی نہیں
 یار بدخوا، آسمان دشمن، زمانہ برخلاف
 یہ مصیبت سہ سکے جانِ حسریں اتنی نہیں
 جس قدر بیباکیوں کی ہیں ادائیں چکی
 شوخیاں بچھ میں، نگاہِ شر مگیاں اتنی نہیں
 ہم نے دیکھا ہے زمانہ ہم نے برتے ہیں
 بندہ پروردہ ظلم کی کثرت کہیں اتنی نہیں
 آپ جاتے ہیں، تو اس کو ساتھ لیتے جاتے
 پھر پلٹ آتے، نگاہِ واپسیں اتنی نہیں
 بد نصیبوں کو ترے مرکز ہوئی راحت نصیب
 آسمان جتنا مخالف تھا زمیں اتنی نہیں
 بستکدے میں دل ٹٹو لو دل جنابِ شیخ کا
 بُت چُر اگر جس میں رکھ لیں آستین اتنی نہیں
 وہ دھواں اٹھا فلک پر سر اٹھا کر دیکھیے
 پھر نہ کیسے گا کہ آہ آتشیں اتنی نہیں

پہلے دیکھی غور سے تصویر یوسف پھر کسا

جتنی دیکھت میں ہے اچھی دلنشیں اتنی نہیں

عیب اپنے کچھ ہیں کو خوب آتے ہیں نظر

خوف ہو جس کا نگاہ نکستہ چلیں اتنی نہیں

جس قدر مضمون بھرے ہیں دل میں سچو دیکھیں

آسمان تو ہم بنا دیں یہ زمیں اتنی نہیں

خدا کے پاس چلا ہوں خدا خدا کر کے

درِ قبول سے ہٹ آئے ہم دعا کر کے

ذرا سا منہ نکل آیا ترا جفا کر کے

زبان بند ہوئی وصل کی دعا کر کے

وہ خود بھی روٹھ گئے ہیں مجھے خفا کر کے

رہیں گے آج تو ہم جان بھی فدا کر کے

غور ہم کو مٹانا ہے التجا کر کے

پھرے ہیں کعبہ سے اسی شیخ آپ کیا کر کے

کہ وہ نواز گئے سر مرا جفا کر کے

بُرا بسا کوئی سب میں مرا جفا کر کے

ڈبو دیا مجھے مشہور پارسا کر کے

ملا ہے چین یہاں ترکِ مدعا کر کے

زبان کاٹ رہا ہوں ترا گلا کر کے

بُلا یا موت کو برسوں میں التجا کر کے

حجاب آ رہی گیا ہم کو التجا کر کے

ہمیں تو رنج نہ ہو جان بھی فدا کر کے

خیالِ یار میں مرنا وصال سمجھا ہوں

اداسے شرط بناوٹ بھی لطف دیتی ہے

مٹی ہے دولتِ دیدار دل کے صف میں

عطا ہو یا نہ ہو کچھ ہم کو اس سے کب

زباں پہ رہتی ہے ہر وقت توبہ استغفار

رہوں گا شکر کے سجدے میں حشر تک ضرور

کرم کیا کبھی مجھ پر تو حیل گئے دشمن

غورِ کبر نے آخر گناہ گار کیا

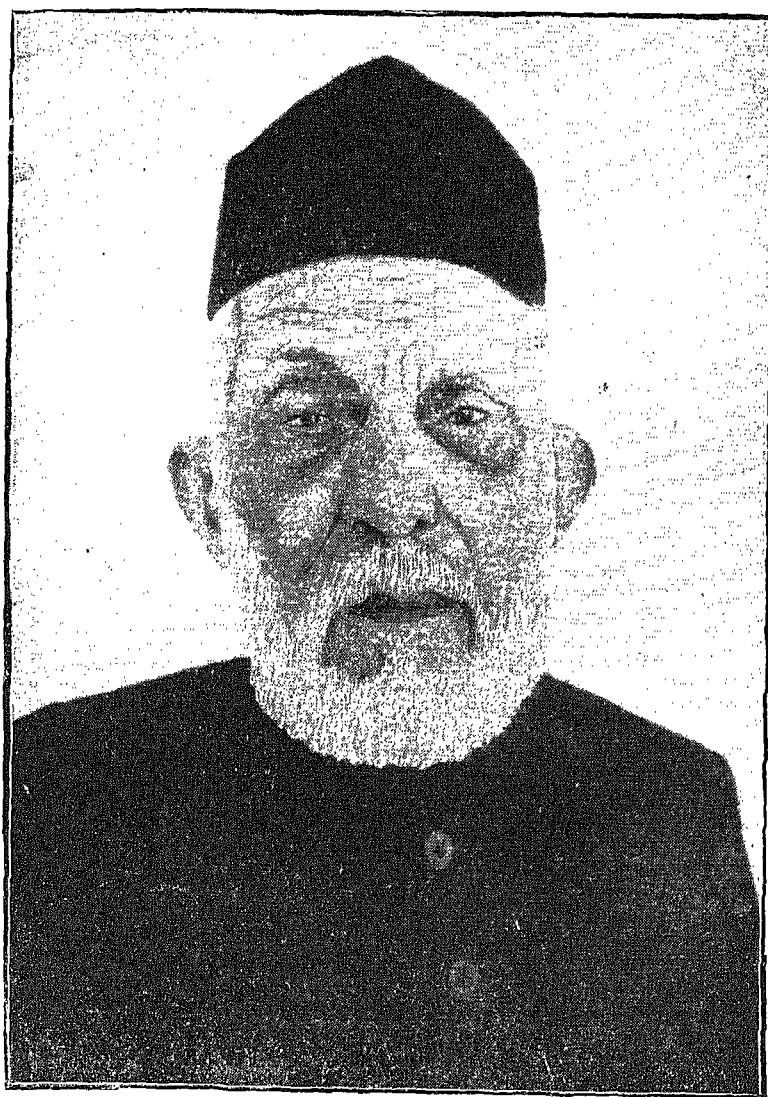
عذاب کتنے ہیں جس کو ہوسِ دنیا کی

کہیں نہ عشق کے دفتر سزا نام کٹ جائے

وظیفہ خوانی بخود کار از سمجھے بھی
 بتوں سے ربط بڑھا یا خدا خدا کر کے

مناقب لکھنوی

۲۳ مارچ ۱۹۴۱ء



نائب الڪهنڙي

غزل

وہی ذرت باری کو پہچانتا ہے
جو اپنی حقیقت کو خود جانتا ہے
اٹھاتا ہے دل دلتیں زلتوں پر
گھر میرا کہا نہیں مانتا ہے
طریق تیار در در طریق تفاعل
یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے
حسیت و کماں ہے لغو ان گریہ
پہاں اور کچھ دلیں تو جانتا ہے
ستارہ میں چپے راضی ہے ررنہ
گلہ کیجئے تو برا مانتا ہے
بری ہونیں لوٹ گئے سے گرد
مجھے اپنا کردار میں سنا ہے
اردو سنیں نہیں اردو میرا تفاعل
جے نکل دامن گر و زنا ہے
صفائی کہاں خاکدان جہاں میں
وہ لب کر کر ہے جو تو جانتا ہے

غیمت ہے تائب کا دم لکھن میں
وہ جو کچھ برابرا جانتا ہے

الذام
نکسار میرزا ناتب قزلباش
۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء

ثاقب لکھنوی

سرگزشت

میر ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، اور تاریخ ولادت ۱۹ رمضان المبارک ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) ہے۔

سلسلہ نسب علی قلی خاں شالو سے ملتا ہے، جو شاہ ظہار صوفی کے معتد علیہ اور طبرستان کے باشندے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ نے اکبر آباد آکر سکونت اختیار کر لی۔ مگر میرزا چھ ماہ کے ہوں گے کہ ان کے والد کو اکبر آباد چھوڑ کر لکھنؤ آنا پڑا، جہاں تا حال ان کی سکونت ہے۔ ابتدائی تعلیم پڑانے طرز پر لکھنؤ ہی میں ہوئی، انگریزی پڑھنے کے لیے چار سال آگرے میں قیام رہا۔ آگرے ہی میں میر مومن تنفی کی مجلس سے ذوق شعر گوئی پیدا ہوا اور یہیں مشق سخن کی مبنیاد پڑی۔ دیونا طبع ہو چکا ہے۔

ثاقب کتابی چہرے، چہریرے جسم اور درمیانی قد کے نیک صورت، خوش اخلاق اور حسن رسیدہ بزرگ ہیں۔ بذلہ سخنی و نظر ائست گفتگو میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دوست نوازی، مذہب کی پابندی

اور خلوص و محبت سے ملنا ان کی نمایاں صفات ہیں۔ عرصے سے ریاست محمود آباد سے وثیقہ پاتے ہیں، اور شبانہ روز یادِ حسنا اور فکرِ شعر و سخن میں مشغول رہتے ہیں۔

ان کے نزدیک شاعری کا روحانی پہلو اہم ہے اور وارداتِ قلبی کو نظم کرنا ادلی ہے۔

اُردو زبان میں ہندی، بھاشا، وغیرہ کے جو الفاظ شامل ہو چکے ہیں اور جن کو اہل زبان لکھتے اور بولتے ہیں، ان کو ثاقب صاحب کی رائے میں پرستور باقی رکھا اور استعمال کیا جائے۔ لیکن جدید الفاظ تا وقتیکہ اساتذہ کا گروہ ان الفاظ کو داخل اُردو زبان نہ کرے استعمال نہ کیے جائیں، جیسے ”ستی“ کا لفظ ۵

ذرا دیکھ پروانے کروٹ بدل کر

ستی ہو گئے شمعِ محفل میں جل کر

اُردو ادب کی خدمت کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ جو طریقہ ”بزمِ ادب رام پور“ نے اختیار کیا ہے، وہ پسندیدہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انشا پرداز اور شعراے بالکمال کو خاص خدمات سپرد کی جائیں، تاکہ وہ اپنے مقام پر بیٹھ کر اطمینان سے کام انجام دے سکیں۔

کلام میں ردیف و قافیہ کی پابندی ضروری جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک بے قافیہ نظم متبذل ہوتی ہے اور اُس سے شاعر کا تصویر طبع ظاہر ہوتا ہے۔

دیگر اساتذہ کے حسب ذیل اشعار آپ کو پسند ہیں :-

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی غالب
 اب کسی بات پر نہیں آتی
 وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا “
 تو پھر، اے سنگِ دل، تیرا ہی سنگِ ساکن بیچ
 میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا چھوٹوں “
 وہ ستگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
 آگے کسو کے کیا کریں دستِ طبعِ دراز میر
 وہ ہاتھ سو گیا ہے سر ہانے دھرے دھڑک

میر و غالب کا کلام بہت زیادہ یاد ہے :-
 نظم میں سودا، ذوق، اور مومن خاں کو، اور غزل میں میرزا
 غالب، خواجہ میر درد، میر تقی، اور میر سنوز کو استاد مانتے ہیں۔

انتخابِ کلام

پر دہ رہا کہ جلوہ وحدت نما ہوا غش نے خبر نہ دی مجھے کب سامنا ہوا
گلشن سے اٹھ کے میزِ ماکاں دلیں آگیا اک داغ بن گیا ہے نشینِ جلا ہوا
کیا تیرگی لیے ہوئے آئی شعاعِ نور دیکھا شبِ فراقِ ازل کا لکھا ہوا
جب تک تھا میں عروج پہ تھا حُسنِ جانتا پھر کچھ خبر نہیں کہ مرے بعد کیا ہوا

کہنے کو مشقِ پر کی اسیری تو تھی مگر

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا وہ بد نصیب ہوں کہے میں بھی خدا نہ ملا
شریکِ قید تھے جذباتِ دل مگر بیکار قفس تھا ایسا کہ نالوں کو رستخانہ ملا
عدو کے مارے ہوؤں سے زمانہ مملو ہو قتیلِ دوست جہاں میں مرے سوانہ ملا
ذرا سی خاک سے پیدا ہوا تھا دلِ لیکن جہاں سمائے جہاں ایسا دوسرا نہ ملا

یہ کس نے غم کدہ دنیا کا نام رکھا ہے

ہیں تو کوئی یہاں دروِ آشنا نہ ملا

عشقِ مظلوم بے خطا نہ ہوا حُسنِ اچھوں میں بھی بُرا نہ ہوا
سوئے والوں کو کیا خبر ہے ہجر کیا ہوا ایک شبِ میر کیا نہ ہوا
ہنس کے بھی رو کے بھی کہا لیکن مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا
بسترِ اٹھانہ کوئے قاتل سے شکر ہے پاس پوریا نہ ہوا
آشنا تھا مذاقِ عشق سے دل تلخ کامی سے بے مزانہ ہوا

نہ ذکرِ انبساط کر کہ دوشِش ہو چکا خوشی کی فکر کس لیے وہ دل کسان چھو چکا
 یہ خندہ طرب نما مبارک اہلِ دہر کو بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
 نہ ڈھونڈ اہلِ دل کو اب گے جوشِ قلزمِ فنا متاعِ درد جن میں تھی وہ کشتیاں بھو چکا
 رہے وہ دل میں مدّتوں مگر سنبھل سکا یہ مزاجِ حسن و عشق کو بہت دنوں سو چکا

یہ آشیانہ ستم چین میں ہو تو خوب ہو
 یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفسِ تیرا چو چکا

آکھ پڑتے ہی نہ تھا نامِ شکیبائی کا درِ میخانہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا
 آئینہ جس میں سداؤ کے ابھر کیا حسن ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
 آنے دے نیند تو سب تیں مگر اے توبہ نالہ عاشق کا اور اُس پر شپ تنہائی کا
 پاکدامانی یوسف تھی زلیخا کو سزا راستہ چاک سے پیدا ہوا سواری کا

شوقِ پا بوسی محبوب تھا ورنہ ناقب
 سنگِ در پر کوئی موقع تھا جینائی کا

بنتے ہی گھر ابتدا میں روکشِ انجام تھا تنکے چن کر جب نظر کی آشیاں لے ام تھا
 بس یہی فقرہ کہ ”شامِ محبے مارا مجھے“ کوئی کہ آتا تو کتنا مختصرِ نغمہ تھا
 میرے نالے تھے شبِ فرقت میں کتنے بھرل اُن کے کانوں میں مگر اک شوہرِ ہنگام تھا
 سر چڑھایا میں نے چُن چکر خسِ خاشاک کو باغ کے تنکے تھے وہ چن کا شیمِ نام تھا

معرفتِ غم کی نہیں اور پوچھتے ہیں حالِ بحر

بس یہی کمدوں کہ ہاں آرام ہی آ رہا تھا

جب میں کتا ہوں کوئی وصل کا سالنہوا کال میں آتی ہے آواز کہ ”جی ہاں نہرو“

بوسے گل چھو لوں میں ہستی نھی مگر رہ سکی
میں تو کانٹوں میں با اور پریشاں نہ ہوا
حال وہ تھا کہ جسے دیکھ کے دشمن نہ ہنسا
زخم وہ تھا کہ جو ممنون نہ سکاں نہ ہوا
غنچہ و گل تو ہیں ہنسل مگر فرق کو دیکھ
ایک گریاں نہ ہوا دوسرا خداں نہ ہوا

گو ہر عشق کی تابیابی و عزت کو سمجھ

بھردیا صحنِ جہاں کو مگر ارزاں نہ ہوا

دل کے چھوٹے نظم نہیں سکتے بسیدِ خاک
جو گرا آنسو وہ تارا ہو گیا افلاک پر
صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر
ٹھیکے تھی ہی نہیں کوئی دلِ صچاک پر
دم نہیں لیتا دھواں ل کا نظر آتے تو کیا
سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدہ اور اک پر
آتشیں ہوتا نہ آبِ خاک ز اوستا مگر
آفتاب ایسا ہی تپکا تھا عشب کی ناک پر

بارِ خوں کیوں کر اٹھالیتے ہیں نہ نازک مزاج

زرد ہو جائیں جو رنگ آئے کوئی پوشاک

خوش ہو سکا نہ حالِ دل زار دیکھ کر
جلتا ہے خیر میری شبِ تار دیکھ کر
وقفِ زبانِ اہلِ حسد ہے لہوِ مرا
خوش ہو رہا ہوں وادیِ پر خار دیکھ کر
پتھر نہیں کہ طور کے وار آزمائے جایا
اے برقِ حسنِ حالِ دل زار دیکھ کر
طے کر کے آج خانہ بدوشی کی منزلیں
بٹھا ہوں اُس کا سایہ دیوار دیکھ کر

ہے روشنیِ نفس میں مگر سو جھتا نہیں

ایرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں
دل مجھ سے کہہ رہا ہے اوبے خبر جلا میں
ٹڑپا دیا ہر دل کو شایاں ہر صغیر و
یونہی پھر اک صد دھڑٹوٹا نفسِ چلا میں

وہ نزع کی خوشی جسم جہاں نہ تھی اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہ گیا میں
رکھتا ہے جذب کتنا کاستانہ محبت دیکھا نہ مڑ کے دل نے دیتا ہا صد میں

پھر اور کس طرح سے اُڑے مکاں کو سجتا

قصیر لحد میں آ کر تصویر ہو گیا میں

ریشم کے بھی آئینہ رخسارِ خواہاں ہو گئیں خون اہلِ عشق کی بوندیں گستاہاں ہو گئیں

زندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات جو دعائیں کہیں وہ سب تیری گہاں ہو گئیں

اس ہوائے دہر میں جمعیتِ خاطر کہا دل کو جانے دو دینہ زلفیں کیوں پریشان ہو گئیں

ٹوٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیان ہو گئیں

کم نہ سمجھو جس میں سرمایہٴ اربابِ غم

چار بوندیں آنسوؤں کی بڑھکے طوفان ہو گئیں

لاغری سے اک ورق ہونے فترتِ تاثیریں جان پڑ جائے جو کام آئے تری تصویر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے عالمِ نقش و نگار کہ گئی سب کچھ خوشی پر وہ تصویر میں

خون آنکھوں سے نکلتا ہے تو بیکلے مبرک ہاں تمنا بھی نکلتی ہے مگر تاحسبیر میں

نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا اضطرابِ دل نظر آنے لگا تحسیر میں

آہیں کرتا جہاں کہ زورِ ناتوانی ہو بہت

جھٹک چلا ہے چرخ گر جانے گا دو اک تیر

اک کیفِ بخودی میر گٹی شبِ وصال کی اچھا ہوا خبر نہ ہوئی اپنے حال کی

ہر قطرہ خونِ دل کا ہو قاتلِ سوزِ دردِا یارب دراز عمر ہو روزِ سوال کی

اتنا بدل دیا تھا مرا رنگِ ہجر نے مُنہ دیکھتی رہیں مرا راتیں وصال کی

گھلتی نہیں حیات میں بے منت اجل بے لاگ بندشیں ترے زلفوں کے جال میں

پہنچا دیا کلام کو ناقب نے عرش پر
تقلید کر کے میر سے صاحب کمال کی

ایک ایک گھڑی اس کی قیامت کی گھڑی ہو

جو جبر میں تڑپا سئے وہی رات بڑی ہو

یہ ضعف کا عالم ہے کہ تقدیر کا لکھا

بستر پہ ہوں میں یا کوئی تصویر پڑی ہو

بتیابی دل کا ہے وہ دلچسپ تماشا

جب دیکھو شبِ ہجر مرے در پہ کھڑی ہو

اب تک مجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا

کیا جانے کس آنکھ سے یہ آنکھ لڑی ہو

آدھی سے زیادہ شبِ غم کا ٹپکا ہوں

اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہو

اپنے ہی دل کی آگ میں آخر گھل گئی

شمعِ حیاتِ موت کے سانچے میں ڈھل گئی

تاثرِ جبر کون بتاتے کہ میں تو میں

ہوتے ہی شامِ دہر کی صورت بدل گئی

سحرِ نگاہ میں نہ کہوں پھر تو کیا کہوں

چٹکی نہ تھی جو میسر سے کیلے کو مل گئی

سہو کر نڈھال دل کی بحالی محال ہے

بجلی تو ہے نہیں کر گری اور سنبھل گئی

ہر کچھ امیدِ زیتِ قفس میں بچے مگر

اپنی ہی داستاں سے طبیعت بہل گئی

کہاں تک جفا حسن والوں کی ستے جوانی جو رہتی تو پھر سر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشین نہ جلتا نشانی تو رہتی بہارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

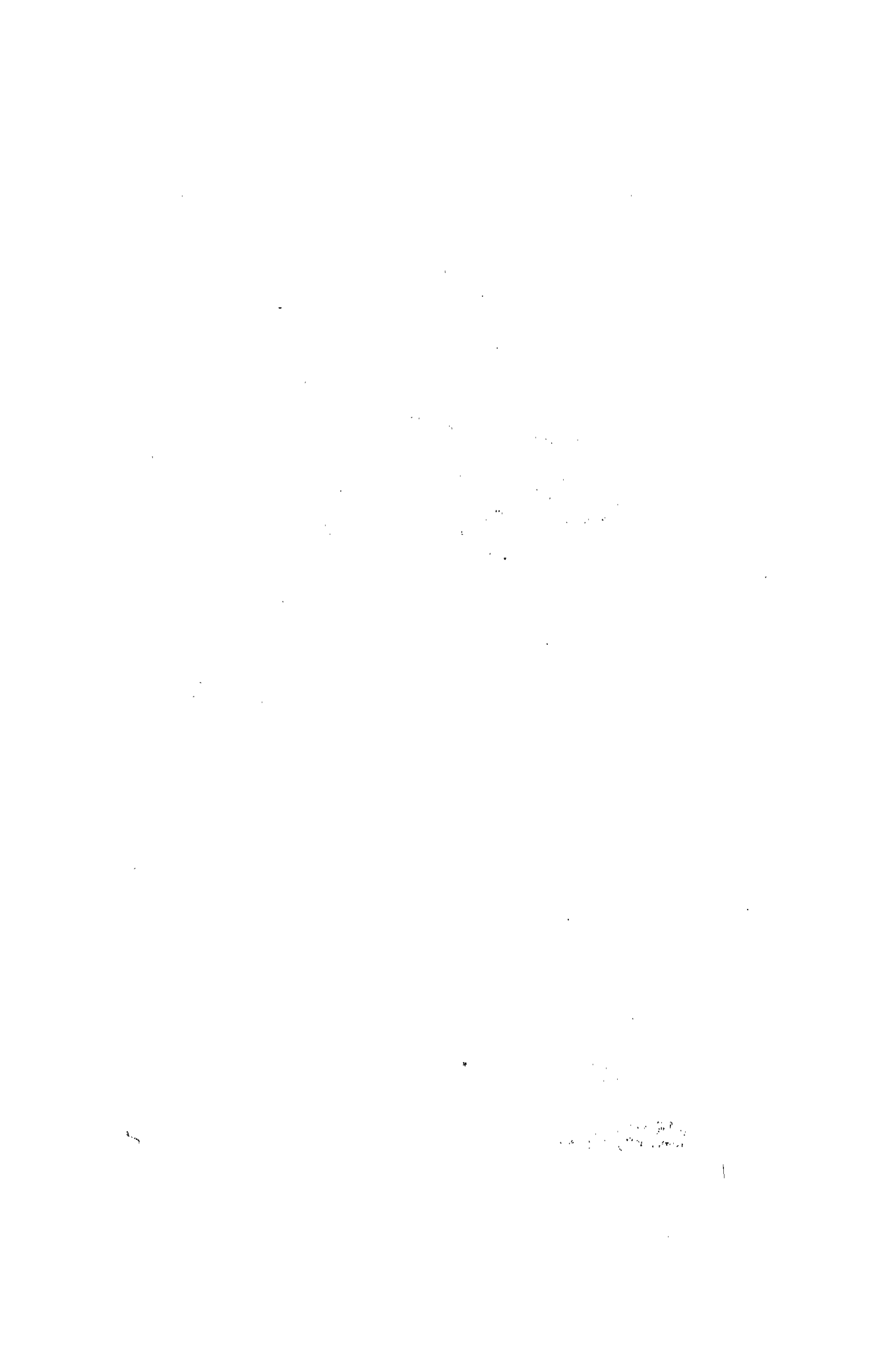
زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ناقب

کنارے پہ آہی لگی بہتے بہتے

جگر مراد آبادی

۲۴ دسمبر ۱۹۳۰ء





جگر مراد آبادی



جو کسرتن چلن میں نہیں جواز توں میں نرا نہیں تے جس کا بھی قصہ ہے، ملے شوق ہی کا کھل نہیں
 سے وہ شیش پر چستیں رنجے لے ہی کا گھلا نہیں تے جے حسن کی خیر و خستہ، میں کب نہیں
 جے میں ہی خود نہ تیا سکوں، مراد ازل ہے وہ راز دل جے خیر دوست سمجھ سکے، اے ساز میں کہہ نہیں
 مراد دل بھی، مرا شوق بھی ہے بند سچ عوام سے ترا جگر ہی، ترا دل بھی ہے درد دل کی نہیں
 یہ رین جھسک کر، غب ترا گر آہ و اخطا ہے خیر اے ساز گار، رزق کیا ہے سمیت ہی نہیں
 وہ ہزار دشمن عاب بھی، تجھے پھر بھی خیر عزیز ہے جے خاک پا رہی ہو گئی، وہ ہزار بھی توڑ نہیں
 سے وہ دشمن پیش کہاں، اے سرزمین پیش کہاں کسی ادبی کی پکار ہے، مری رنگ کی صد نہیں
 وہی ربط عشق وصال سے، ترا اور کچھ جو خیال ہے یہ سمجھو، "نہیں ہے کچھ کچھ" یہ نہ کہہ کر جنس و فانیس

اے ششوں میں ترا کہیں، نفیس میں ہیں نقابیں
 مری سکریں ہیں جے سنگ، ادب کثیف "کی نہیں"

فکر و کلام
 ۱۱/۱۱/۱۱

جگر مراد آبادی

سرگزشت

علی سکندر تام، اور جگر تخلص ہے۔ ۱۸۹۰ء میں اپنے وطن مراد آباد میں پیدا ہوئے۔

ان کے مورث اعلیٰ، مولوی محمد سیح، شاہ جہاں بادشاہ دہلی کے استاد تھے۔ کسی بات پر بگڑ کر چل دیے، اس بنا پر خاندان کا ایک حصہ اعظم پور ہاسٹ میں رہ گیا، اور کچھ لوگ مراد آباد آ گئے۔ ان کے دادا حافظ محمد نور، التخلص بہ نور خوش گو شاعر تھے۔ ان کے والد مولوی علی نظر، نظر تخلص بھی اپنے وقت کے منتخب شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے ایک دیوان ”بارغ نظر“ کے نام سے چھوڑا ہے۔

جگر کی انگریزی تعلیم صرف انٹرنس تک ہے؛ لیکن فارسی کی استعداد بہت اچھی ہے۔

جس زمانے میں داغ دہلوی، رام پور سے حیدر آباد پہنچے، جگر بھی وہاں مقیم تھے، اس لیے اپنا کلام داغ کو دکھانے لگے۔ حیدر آباد سے واپسی پر مفتی امیر اللہ تسلیم کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔

آخر میں رسا رام پوری سے اصلاح لی۔

جگر نے اپنے متعلق لکھا ہے :-

”بچپن ہی سے حُسن سے مجھے ایک خاص ربط و نسبت رہی۔

رفقہ رفقہ یہ نشہ تیز تر ہوتا گیا۔ اس کی تکمیل آگرے کے قیام میں ہوئی۔

زائر بعد حالات اس درجہ اندوہناک ہوتے چلے گئے کہ غالباً حضرت اصغرؒ

کے توسط سے مجھے آستانہ بنگلور سے شرفِ غلامی حاصل نہ ہو جاتا، تو

یقیناً یا تو خود کشتی کرچکا ہوتا، ورنہ بقول خود میرے ایک دوست کے

ذہنیت صحرا ہوتا۔ میری تربیت حضرت اصغر گوندوی رحمۃ اللہ علیہ کے

نفوس کی رہیں منت سے اور صحیح معنوں میں موصوف کی ذات

گرامی میری اصلاحِ شعر کی بھی ذمہ دار ہے“

جگر کا درمیانی قد اور سانولا رنگ ہے، متوسط الاعضا، منسراج

پیشانی اور کشادہ چشم ہیں۔ سر کے بال بڑے رکھتے ہیں۔ چہرے سے

شاعرانہ وحشت، ٹپکتی ہے۔

ریا کاری اور بناوٹ سے نفرت ہے۔ جس سے ملتے ہیں، فراخ

دلی اور گرم جوشی سے ملتے ہیں اور حیر سے نفرت ہوتی ہے، اُس

کا منہ دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ خلوص و خودداری ان کی نمائیاں

خصوصیات ہیں۔

کلام جس ترتیم آمیز انداز سے پڑھتے ہیں، اُس کے خود ہی

موجد بھی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ عام فہم طریقہ ادا اور ترکیبِ بندش سے اعلیٰ

تخیل و معنی آفرینی، علم و ادب اور زبان کی خدمت ہے اور ثقیل

الفاظ و غیر مانوس تراکیب استعمال کرنا ادب کو غارت کرنا ہے۔
ہندی کے مانوس الفاظ بھی کم استعمال کرتے ہیں۔
ان کو دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں:-

اقبال نہیں منت کش تابِ شیدن و استاں میری

خوشی گفتگو ہے، بے زبانی ہر زباں میری

حسرت شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

دیکھنا بھی تو اُنھیں دُور سے دیکھا کرنا

عصر حاضر میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا طفر علی خاں کے
اقبال اور علامہ اقبال اور حضرت اصغر گونڈوی کے شاعرانہ کمال کے
گر ویدہ ہیں۔

ردیف و قافیہ کی پابندیاں ان کے کلام میں مسلسل پائی جاتی ہیں
اور اس التزام کو شعر کہنے کے لیے واجبی تصور کرتے ہیں۔

کلام کا بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، نظم بہت کم کہتے ہیں۔
عین مناظر کے مشاہدے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہی بیشتر غزل کی
صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

شاعروں کے دعوت ناموں پر آئے دن سفر میں رہتے ہیں۔

انتخابِ کلام

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
 خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
 نغموں میں سمیایا ہوا وہ رات کا عالم
 وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لحسات کا عالم
 اللہ سے وہ شدتِ جذبات کا عالم
 کچھ کہے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم
 چھایا ہوا وہ نشہ صبا کے محبت
 جس طرح کسی رندِ حنر بات کا عالم
 وہ سادگیِ حسن وہ محبوب نگاہی
 وہ مختصر صد شکر و تشکایات کا عالم
 نظروں سے وہ معصوم محبت کی تڑاؤں
 چہرے پر وہ مشکوک خیالات کا عالم
 عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے قطرے
 آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم
 وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی ڈ
 وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم
 ایک ایک نظر شعر و شبابِ دمی و نغمہ
 ایک ایک ادا حسن محاسنات کا عالم
 بے شرط تکلف وہ پذیرائیِ الفت
 بے قیدِ تصنع وہ مدارات کا عالم
 نازک سے ترنم میں اشارات کے قطر
 ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم
 وہ عشق کی بربادیِ زندہ کا مرقع
 وہ حسن کی پابندہ کرامات کا عالم
 تھک جانیکے انداز میں وہ دعوتِ جِرا
 کھوجانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

وہ عارضِ پُر نور وہ کیفِ نگہ شوق

جیسے کہ دمِ صبحِ سناجات کا عالم

دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں
 کتنا حسین گناہ کیے جا رہا ہوں میں
 فر و عمل سیاہ کیے جا رہا ہوں میں
 رحمت کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

ایسی بھی اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
 دنیا سے دل تباہ کیے جا رہا ہوں میں
 مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
 تنقیدِ حسنِ مصلحتِ خاصِ عشق ہے
 گلشنِ پیست میں مجھے گل ہی نہیں غریز
 یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
 ذروں کو مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں
 صرف نگاہ و آہ کیے جا رہا ہوں میں
 خودِ حسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں
 یہ جرم گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں
 کانٹوں سے بھی نہا کیے جا رہا ہوں میں
 جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے جگر ہوا ہے ادبِ جستجو کا حق
 ہر ذرے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

اُس رُخ پہ ازدحامِ نظر دیکھتا ہوں میں
 معراجِ شوق و جذبِ اثر دیکھتا ہوں میں
 تاثیرِ اتفاقاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
 تنہا نہیں ہے عشق ہی بربادِ جستجو
 کانٹوں کی گود میں گلِ تر دیکھتا ہوں میں
 دنیا ادھر کی آج ادھر دیکھتا ہوں میں
 کونین اپنے زیرِ وزیر دیکھتا ہوں میں
 خودِ حسن کو بھی خاک بسر دیکھتا ہوں میں

رُعبِ جمال و ربطِ محبت تو دیکھنا
 اٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر دیکھتا ہوں میں

وہ جو روٹھیں یوں مٹانا چاہیے
 عشق کا ہر زخمِ کھانا چاہیے
 لذتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال
 زندگی ہے نامِ جد و جنگ کا
 اُن سے ملنے کو تو کیا کیسے جگر
 زندگی سے روٹھ جانا چاہیے
 زخمِ کھاکر مٹ کر جانا چاہیے
 کلفتوں سے جی لگانا چاہیے
 موت کیا ہو، بھول جانا چاہیے
 خود سے ملنے کو تو کیا کیسے جگر

اُن کی جفا پہ ترکِ وفا کر رہا ہوں
ہر لذتِ سزا پہ خطا کر رہا ہوں
کھانا نہ پھر کر ہائے مجھے ہو گیا ہے کیا
جب آگئی ہر ضد مجھے سرکارِ حسن سے
فطرت کو زندگی سے جدا کر رہا ہوں
اب جو بھی کر رہا ہوں بجا کر رہا ہوں
لیجے بلند دستِ دعا کر رہا ہوں
ہر نقشِ آرزو کو مٹا کر رہا ہوں
میری اداے شکرِ حضوری تو دیکھنا
صدِ شکوہ و سراقِ ناکر رہا ہوں

محبت میں یہ کیا مقام آ رہے ہیں
یہ کہ کہ کہ ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ بے طرحِ نادم ہوئے جا رہے ہیں
ہمہ شعورِ نغمہ ہمہ حسن و خوشبو
کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں وہ آیا رہے ہیں
خدا جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں
وہ کچھ گنگنائے چلے آ رہے ہیں
وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں
وفا کر کے بھی ہم تو شر مار رہے ہیں
مزانِ گرامی کی ہویسریا رب

کئی دن سے اکثر وہ یاد آ رہے ہیں

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پچپانی نہیں جاتی
طبیعت آسکے پھر تاحدِ امکانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نہیں جاتی یہ دیوانی نہیں جاتی

کسی صورت نمودِ سوزِ پشانی نہیں جاتی
 بچھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
 نگاہوں کو خزاں نا آشنا ہونا تو آجائے
 چمن جب تک چمن ہے جلوہ سامانی نہیں جاتی
 مزاجِ اہل دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
 کہ جیسے نکھٹ گل سے پریشانی نہیں جاتی
 صداقت ہو تو دل سینوں سے کھینچے لگتے ہیں غلط
 حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی
 نگاہِ شوق کی گستاخیاں توبہ ارے توبہ!
 تلافی لاکھ کرتا ہوں پشیمانی نہیں جاتی
 وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں جاتی
 وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
 چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
 حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی
 محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
 کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
 جگر وہ بھی زمزمنا پامست ہی محبت میں
 مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

دکھاوے اے دل آگاہ عالی ہمتی اپنی
 دو عالم بنکے پھیلا دے دو عالم میں خودی اپنی
 جمال اُن کا مزاج اپنا غم اُن کا زندگی اپنی
 حیاتِ حُسن ہے گویا حیاتِ عاشقی اپنی
 یہاں تک اب جگر پہنچی ہے معراجِ خودی اپنی
 کہ حُسن اک مشغلہ اپنا ہے، عشق اک دل لگی اپنی
 محبت رہ گئی بن کر مکمل زندگی اپنی
 مبارک بخودی اپنی سلامت بخودی اپنی
 زمانہ تھا کبھی اپنا، یہ دُنیا تھی کبھی اپنی
 مگر اب تو نہ شام اپنی، نہ صبحِ سرخوشی اپنی
 مکمل تو کوئی کرے حیاتِ عاشقی اپنی
 خدائی چیز ہی کیا ہے، خدا اپنا خودی اپنی
 مری بربادیوں میں کیوں ہے یا احساس بھی شامل
 مرے سر ڈال دیجے خیر سے شر مندگی اپنی
 اسے سمجھ نہ سمجھ کوئی، لیکن واقعہ یہ ہے
 کہ ترکِ میکشی پر بھی وہی ہے میکشی اپنی
 نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ غیریت ٹوٹا
 حقیقت بے حقیقت مان لی پہچان لی اپنی

جگر رہ جاتے بن کر آہ جو اک کاسہ سائل

نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

دل ماہی بے آب ہو معلوم نہیں کیوں؟	بتیاب ہی بخواب ہو معلوم نہیں کیوں؟
پھلکی شبِ منتاب ہو معلوم نہیں کیوں؟	یکیف مژنا ب ہو معلوم نہیں کیوں؟
وہ جرعہ بھی زہر آب ہو معلوم نہیں کیوں؟	ساتی نے جو بخشا تھا بے صد لطف صد ہر
جیسے کہ یہ سب خواب ہو معلوم نہیں کیوں؟	کل تک یہی دنیا سب دُگل تھی مگر آج
اندیشہ مضرب ہے معلوم نہیں کیوں؟	جو ساز کہ خود نغمہ عرفاں تھا اُسی کو
اب تک اثر خواب ہو معلوم نہیں کیوں؟	دیکھا تھا کبھی خواب معلوم نہیں کیا
میرے لیے بتیاب ہو معلوم نہیں کیوں؟	محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو

اک شعلہ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی	آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
جیسے اُنھیں کو سامنے لاتی چلی گئی	ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی
ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی	ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا
ہر آرزو کی پیاس بجھاتی چلی گئی	ہر موجِ بحرِ حسن سے خود کھیلتی ہوئی
ہر غم کو خوشگوار بناتی چلی گئی	ہر درد کو بدلتی ہوئی انبساط سے
جو گن کوئی ستار بجاتی چلی گئی	ویرانہ حیات کے ایک ایک گوشے میں
رگِ گ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی	بے حرف و بے حکایت و ساز و صدا
یہ کیفیوں کو جوش میں لاتی چلی گئی	کیفیتوں کو جوش سا آتا چلا گیا

کیا کیا نہ حسنِ یار سے شکوہ تھے عشق کو
 تفریقِ حُسن و عشق کا جھگڑا نہیں ہوا
 کیا کیا نہ شرِ سارِ سنا تھی چلی گئی
 تمیزِ قُرب و بعد مٹا تھی چلی گئی
 وہ مست آنکھوں سے پلاتی چلی گئی
 میں تشنہِ کام شوق تھا پیتا چلا گیا
 اُڑتی چلی مجھے بھی اُڑاتی چلی گئی
 اک حُسنِ بے حُبت کی فضا و سبیطیا
 پھر میں ہوں اور عشق کی بتیا بیاں بگڑے
 اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی

جلیل مانگپوری



جلیل مانک پوری

1. The first part of the document is a list of the names of the persons who have been appointed to the various offices of the city of New York.

اس شہر ہے وہ آج بے امن ہے
 منتون نے باد چوم پر جا کہا ہے
 اٹھا ہوا عرش ہے جانی کو اگر جن
 تے ہر خاتم کے درن کہا ہے
 انکو صبر کوں ہے انہی نکلے گا
 کئی نذر مر رہا اسکا دل ہے
 جب مر جوتو یہی ایسا ہے
 جسم پر میرے ہے ہمارے
 ذکر حبیب ہے نہ ہونعت کسی جہاں
 جن پر کام ہی تھا کہ زار ہے

جلیل مانکپوری

سرگزشت

جلیل حسن نام ، جلیل تخلص ، اور والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں بمقام مانکپور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید سے فراغت پائی۔ طلب علم کا بیشتر زمانہ لکھنؤ میں گزرا ، اور وہیں عربی و فارسی میں استعداد بہم پہنچائی۔

سخن گوئی کا شوق ابتدائی سے تھا۔ بین سال کی عمر میں امیر بینائی کے سلسلہ تلمذ میں داخل ہوئے اور جملہ ضروریات و مستحکات شعری حضرت امیر ہی کے فیضانِ محبت سے حاصل کیے۔ رام پور میں امیر اللغات کی تدوین کے لیے دفتر کھولا گیا ، تو اُس کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ سفر بنارس و بھوپال وغیرہ میں بھی حضرت امیر کے ہمراہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ جنوری ۱۳۱۳ھ کو استاد کے ہمراہ حیدر آباد پہنچے۔ اُس زمانے میں عین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی اعانت اور مہاں نوازی شامل حال رہی۔ حضرت امیر کی وفات کے بعد ۱۳۲۲ھ میں غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہاؤ نظام دکن نے اپنی استاد کی شرف بخشا اور داغ مرحوم کی جگہ پر مامور

فرما کر ”جلیل القدر“ کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔

مصور پر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف چاہ سابع، خلا اللہ
ملکہ جب سریر آراے سلطنت ہوئے، تو انھوں نے بھی اپنی استادی کے
شرف سے مشرف فرمایا، اور پہلے ”نواب فصاحت جنگ بہادر“ کے خطاب
سے سرفراز کیا، پھر ”امام الفن“ کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔
شہزادے بھی حسب احکم سرکار اپنا کلام انھیں کو دکھاتے ہیں۔

جناب جلیل حیدر آباد سے دو رسالے ”محبوب الکلام“ اور ”دیدہ آصفی“
نکالتے رہے ہیں۔ ایک مبسوط رسالہ تذکیر و تائید الفاظ پر بھی تصنیف
کیا ہے، جو مولانا عبد الحکیم شرر لکھنوی کے مقدمے کے ساتھ چھپ چکا
ہے۔ منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔ تاریخ سخن پہلا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا۔
- ۲۔ جاں سخن دوسرا دیوان، جو پہلی مرتبہ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔
- ۳۔ رُوح سخن تیسرا دیوان، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔
- ۴۔ سراج سخن تصانیف مدحیہ، قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ ہے۔
- ۵۔ معراج سخن نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ہے۔
- ۶۔ گلِ صدربگ رباہیات کا مجموعہ ہے۔

اُردو کی ترویج کے متعلق ان کا خیال ہے کہ فی زمانہ جو کچھ ہو رہا ہے
وہی طریقہ مناسب ہے، یعنی نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کا بکثرت ہونا
اُردو کے قواعد مرتب کیے جانا اور اُردو کے لغات کا مدد ہونا۔

ہندی اور سنسکرت وغیرہ کے جو الفاظ اُردو میں شامل ہو گئے ہیں
ان کے خیال میں بس وہی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

مفرد اشعار میں ردیف و قافیہ کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے، مگر قطعہ، نظم، غزل، مثنوی وغیرہ میں قافیہ ضروری سمجھتے ہیں، البتہ ردیف کا معاملہ اختیاری ہے۔

اساتذہ اُردو کے حسب ذیل اشعار آپ کو پسند ہیں۔

آتش بڑا شور مٹتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

وعدہ خلاف یار سے کیوں یہ نامہ بر

آنکھوں کو روگ دیگئے ہوا انتظار کا

بڑے مزے سے گزرتی ہے بخودی میں تیر

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ

وہ منتوں سے کہے چپ رہو خدا کے لیے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

رُخ پُر نور میں جگہ تھی کہاں

رکھنے والے کو دیکھیے تل کے

منٹھ پہ رکھ دامن گل روئیں گے مُرفانِ جن

خاک اڑائے گی گلستاں میں صبا میرے بعد

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہو ٹنڈ پر وقت
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
 اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
 پھر ملیں گے اگر خدا لایا
 یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہو
 دگر نہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہو

غالب

میر

ناسخ

انتخابِ کلام

کسی کا حُسن اگر بے نقاب ہو جاتا نظامِ عالم ہستی خراب ہو جاتا
 نگاہِ لطف نہیں اُن کی - خیر ہو ورنہ کچھ اور حال ہمارا خراب ہو جاتا
 جو آپ آتے تو دنیا مری بدل جاتی خوشی نلال، سکون اضطراب ہو جاتا
 نظارۂ رُبح دلدار ہر طرح دشوار نقاب اٹھتی تو حائل حجاب ہو جاتا
 ہزار ہستے رہے گل، مگر نہ تھا ممکن کہ میرے زخمِ جگر کا جواب ہو جاتا
 جو موت کا نہ محبت میں آسرا ہوتا کسی حسین پہ مرنا عذاب ہو جاتا
 اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسمِ جہاں مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

وہ آنے والے ہیں شب کو یہ چاہتا ہوں تسلیل

غروبِ شام سے قبل آفتاب ہو جاتا

ہوا اچھا مرے حق میں جنوں کا جوش ہو جانا

وہ کہتے ہیں کہ اب بیکار ہے روپوش ہو جانا

بھلا دیتا ہے ساری کلفتیں شہاے ہجران کی

تصور میں کسی کا زینتِ آغوش ہو جانا

دیمِ نظارہ آتی ہر جیا، اے جاں تو آنے دو

مری پلکوں کی چلن ڈاکر روپوش ہو جانا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے درپردہ محبت کا

جلیل، اُن کا تھارے نام پر خاموش ہو جانا

جس دن سے بلبلیں سوئے دامِ وقفہ گئیں

نظارہ ہمارچین کو ترس گئیں

قاصدِ پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول

کستا فقط یہ اُن سے کہ آنکھیں ترس گئیں

گم کون قافلے سے ہوا جس کے واسطے

جانیں بھل کے صورتِ بانگِ جرس گئیں

گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں

کچھ رو گئیں، تو کچھ مرے رونے پہ منہ گھٹیں

بزمِ نشاط و عیش کا اب ذکر کیا، جلیل

وہ دن گئے وہ راتیں بھی ایسی ختمِ نفس گئیں

آنکھیں تو ہیں ساقی کی اگر جام نہیں ہے

اس پر اثرِ گردشِ ایاں نہیں ہے

جب سے مجھے آرام ہے، آرام نہیں ہے

قاتل کی گلی رہ گذرِ عساں نہیں ہے

وہ لطف نہیں، وہ سحر و شام نہیں ہے

بیل سے بے کیا رنگ گلِ دام نہیں ہے

رندوں کو غمِ بادۂ گلہام نہیں ہے

کشتی ہے نہ گھٹتی ہے نہ بھٹی ہو شبِ غم

جب تک خلشِ درد بھٹی اک گونہ نہ تھا

چلنے کی اجازت ہے، فقط تیغِ رواں کو

تم یاں ہی گئے کیا، مری دنیا ہی بدل گئی

کچھ دامِ وقفہ پر نہیں ہو قوفِ آسیری

تامان ہیں جو دیتے ہیں جلیل آپ کو الزام

اس دور میں کس کو ہو جس جام نہیں ہے

دل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

جن کے جلوے پہ سیر طرز نظر آتے ہیں

کھینچ دی مسئلہ کی ہو یہ ہارِ گل نے
بھول جتنے ہیں رخ و نظر آتے ہیں
کس کا میں دیکھنے والا ہوں؟ نہ پہچانتا
اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں
تھک گیا قافلہ زبست بھی چلتے چلتے
اب بھی منزل کے نشان و نظر آتے ہیں

ہر نظر اُس کی چھلکتا ہوا ساغرِ جلیل

آج ہم پیٹے پہ مجبور نظر آتے ہیں

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے
یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے
وہ اُٹھے، درداٹھا، حشر اُٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے
لگی تھی اُن کے قدموں سو قیامت
میں سمجھا ساتھ سایہ جا رہا ہے
ہمار آئی کہ دین ہوئی کے کئے
گلوں میں رنگ کھیلا جا رہا ہے
مرے دایرِ جگر کو بھول کہہ کر
مجھے کانٹوں میں کھینچا جا رہا ہے
وہاں ہے عمر اور انسانِ غافل
مسافر ہے کہ سویا جا رہا ہے

جلیل، اب دل کو اپنا دل نہ سمجھو

کوئی کر کے اشارا جا رہا ہے

ہماریں لٹا دیں جوانی لٹا دی
تھارے بے زندگانی لٹا دی
صبا نے تو ہر سارے گل فصلِ گل میں
گھٹانے مئے ارغوانی لٹا دی
اداؤں پہ کر دی فدا ساری ہستی
نگاہوں پہ دنیا بے فانی لٹا دی
عجب حوصلہ ہم نے غیظوں کا دیکھا
تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی
نہ کی عُن کی قدوائے ماہِ کامل
فقط رات بھر میں جوانی لٹا دی
جلیل آپ کی شاعری پر کسی نے
نگاہوں کی چادریاں لٹا دی

دل مستِ محبت نہ بہت جوش میں آئے
 دیوانے سے کہہ دو کہ ذرا ہوش میں آئے
 سمجھا میں یہی جھومتی آہیں جو گھٹائیں
 میخانے کو میکش لیے آغوش میں آئے
 کھلتا ہے اس انداز سے گل شاخِ چین میں
 جیسے کوئی ساغرِ کفِ مے نوش میں آئے
 حاجت نہ رہی عرضِ تنہا کی زباں سے
 جذبات کچھ ایسے لبِ خاموش میں آئے
 سنتے ہیں جلیل آج ہوئے تارکِ صبا
 ہر شکر کی جا اب بھی اگر ہوش میں آئے

اد ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی	نگاہِ مست سی دنیا خراب ہو کے رہی
تری گلی کی ہوا دل کو راسِ کیا آتی	ہوا یہ حال کہ مٹی خراب ہو کے رہی
ہماری کشتی تو بہ کا یہ ہوا انجبا	بہار آتے ہی غرقِ شراب ہو کے رہی
وہ آہِ دل جسے سُن سُن کے آپ نہ تھو	خدا ننگِ ناز کا آخر جواب ہو کے رہی
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا ہوں	اٹھی نقابِ حیرت نقاب ہو کے رہی
وہ بزمِ عیش جو رہتی تھی گرم راتوں کو	فسانہ ہو کے رہی ایک خواب ہو کے رہی

جلیلِ فصلِ بہاری کی دیکھیے تاثیر

گری جو پوند گھٹا ہے شراب ہو کے رہی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

دل لیا پسلی نظر میں آپ نے
آتے آتے آئے گا اُن کا خیال
جاتے جاتے بے خیالی جاے گی
آج گودل سے نکالی جاے گی
چاند پر کیا خاک ڈالی جاے گی
باغ سے زرگس نکالی جاے گی
شاید اس میں جان اُلی جاے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ

فصل گُل آتی جنوں اچھلا جلیل
اب طبیعت کیا سنبھالی جاے گی

اس شان سے وہ آج پتے امتحان چلے
اپنی ادائے نیم نگاہی کا واسطہ
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
لے، بیخبر، خبر کہ ترے نیچاں چلے
کتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے
کس کی تلاش میں مرے شکڑاں چلے
آنکھوں میں کون آ کے آئی نکل گیا

ذکر حبیب سے ہو نہ غفلت کبھی جلیل
چلتا رہے یہ کام بھی جیب تک زباں چلے

موسم گل میں عجب بے نگ ہے مینا نے کا
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے
شیشہ جھکتا ہے کہ مٹھ چوم لے پیمانے کا
مٹھ گئے آپ جو پہلے سے قیامت گاہی
شمع کا رنگ جیسے خون ہو پروانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی
ل گیا درد کو پہلو مرے تڑپانے کا
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا
رات بھر حسرت آتش سے جلا کرتی ہے
شمع پر صبر پڑا ہے کسی پردے کے

جان دیدے نہ کرے آہ بہت مشکل ہو عشق کرنے کو عگر چاہیے پروانے کا

محببت پر مغاں میں یہ کھلا راز جلیل

خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

فرے بتیابیوں کے آ رہے ہیں وہ ہم کو ہم انہیں سمجھا رہے ہیں

ابھی کل تک تھی کیسے بھولے بھلے ذرا ابھرے ہیں آفت ڈھا رہے ہیں

وہ بھلی ہیں تو ہوں ان کو مبارک مجھے کس واسطے تڑپا رہے ہیں

ہمارا حال جب دیکھا تو بولے سزا اپنے کیے کی پار رہے ہیں

کبھی ہم نے پیاتھا بادۂ عشق

جلیل اس کے فرے اب آ رہے ہیں

جوش ملیح آبادی



جوش ملیح آبادی

برادر گرام

اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے
 درہ بھلے پہر حلقہ عرفاں میں بدلیگا
 اور صبح کو وہ ناظرِ نظارہ قدرت
 طبعِ جہنم و صحنِ مکتاں میں بدلیگا
 اور دن کو وہ سرگشتہ اسرار و معانی
 بزمِ سحر و نوے ادیبان میں بدلیگا
 اور شام کو وہ مردِ خدا، رنیز خوش اوقات
 رحمتِ کد کا بارہ فروشاں میں بدلیگا
 اور رات کو وہ خلوتی کامل و حشر
 بزمِ طرب و کوچہِ خواباں میں بدلیگا

اور ہو گا کوی جبر، تو وہ بندہ مجبور
 مردے کی طرح خانہ دیراں میں بدلیگا

جو
 ۲۶ فروری ۱۹۶۱ء
 ۱۲ پور

جوش ملیح آبادی

سرگزشت

شبیر حسن خاں نام، جوش تخلص اور ۱۸۹۶ء سال ولادت ہے۔
ان کے اسلاف کابل سے آکر قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکن پذیر ہوئے
اور ایک عرصہ دراز کے بعد ملیح آباد چلے آئے۔ ان کے والد نواب
شبیر احمد خاں، دادا نواب محمد احمد خاں اور پردادا نواب فقیر محمد خاں
تھے۔ مؤخر الذکر شاعر بھی تھے، اور گویا تخلص کرتے تھے۔ اس خاندان
کے بیشتر افراد سلطنتِ اودھ میں معززہ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔
جوش کی عربی و فارسی کی تعلیم مکان پر ہوئی، انگریزی سینئر مہرج
تک پڑھی۔ شعر گوئی کا جذبہ ۱۲، ۱۳ سال کی عمر سے ابھر چلا تھا۔
ابتدائی کلام حضرت عزیز لکھنوی کو دکھایا۔ اب حدتِ طبیعت و جوش
فطرت رہنما و مصلح خیال ہے۔

جوش گندمی رنگ کے، فراخ چشم، کشادہ پیشانی، اور اچھے خط و
خال کے انسان ہیں۔ چہرے کی ساخت سے اُلواغری، اور تدبیر
پکلتا ہے۔ درمیانی قد، بڑا سرا، اور دوہرا جسم ہے۔ سر کے بال بڑے
رکتے ہیں۔ آواز میں شکوہ و دبدبہ اور گفتگو میں تسخیرِ قلوب کی غیر معمولی

قوت ہے۔ دوست پسند، احباب نواز، فکرِ امروز و غمِ فردا سے بے نیاز،
اور بہت جلد گھل مل جانے والے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ مجموعی حیثیت سے وہ شاعری بہتر ہے، جو
انسانی ذہنیت کو اتقا و قوتِ عمل بخشنے والی ہو سکتی ہو۔

اُردو کی ترقی و ترویج کے بارے میں یہ رائے ہے کہ بکثرت کشمکش
ترجمہ اور تالیف کی جائیں، انجمنیں بنائی جائیں، نئے اسلوب اختیار کیے
جائیں اور زیادہ تفکر سے کام لیا جائے۔

اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے شمول سے
متفق ہیں جن سے شعریت مجروح نہ ہو۔ اسی طرح ردیف و قافیہ
کی پابندیاں ان کے نزدیک اس حد تک روا ہیں کہ شعر میں نقص
و تنزل پیدا نہ ہو، ورنہ بغیر اس التزام کے کہنا مناسب ہے۔ لیکن
خود ان کے جملہ کلام میں ردیف و قافیہ کی پابندیاں موجود ہیں۔

دیگر اساتذہ کے یہ شعرا انھیں پسند ہیں :-

کسائیں نے ”گل“ کا ہے کتنا ثبات

میر

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

غالب

مجھے اب دیکھ کر ابرہق آلودہ یاد آیا

کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں

مومن

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا

کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

تم ہمارے کسی طرح نہ ہو

”

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

فراق خدا کو اہل جہاں جیب بنا چکے، تو فراق

بکرا رہا اُسٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

نظم میں نظیر اکبر آبادی اور علامہ اقبال کو استاد مانتے ہیں۔
غزل کو غیر فطری تصور کرتے ہیں، اس لیے اس صنف میں کسی کو
استاد نہیں مانتے۔ البتہ غزل کہنے والوں میں مومن خاں کے غزل
کو محدود معنی میں بہتر سمجھتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ غزل گوئی ترک کر کے نظمیں کہنا چاہیے،
خواہ وہ کسی صنف کی ہوں۔

جناب جوش کی منظوم تصانیف حسبِ ذیل ناموں سے طبع
ہو چکی ہیں:-

(۱) روحِ ادب (نثر، غزل اور نظم کا مجموعہ)

(۲) نقش و نگار { (نظم و غزل کے مجموعے)

(۳) شعلہ و شبنم {

(۴) حرف و حکایات {

(۵) جنونِ حکمت { (نظموں کے مجموعے)

(۶) فکر و نشاط {

(۷) آیات و نعمات {

انتخابِ کلام

اُسٹی وہ گھٹا رنگ سامانیاں کر
 وہ چمکے عنادل وہ سنکیں ہوائیں
 گھر پاشیاں کر زرافشاںیاں کر
 گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
 گلابی اٹھا اور گل افشاںیاں کر
 گلابی اٹھا جامِ رز اور سلطانیاں کر
 مے لالہ گوں سے گلستانیاں کر
 ہواؤں پہ اڑ اور سلیمانیاں کر
 بگولوں کی مانند چولانیاں کر
 خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
 علم کھول کر چوش بستیوں کے
 جہاں داریاں کر جہاں بانیاں کر

کلِ رات کو

دیدنی تھا میری محفل کا سماں کلِ رات کو
 ناز، کھٹا طغرائش دیوانِ آدابِ ساز
 نہراں تھا وہ بہت نا مہرباں کلِ رات کو
 تیغ، تھپی پیغمبرِ امن و اماں کلِ رات کو
 کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کہاں کلِ رات کو
 چاندنی میں کا کلِ عنبرِ فشاں کلِ رات کو
 ہر کلی کو آہ ہی تھیں ہچکیاں کلِ رات کو
 دینی تھی میری محفل کا سماں کلِ رات کو
 ناز، کھٹا طغرائش دیوانِ آدابِ ساز
 چھوڑ ہی تھی دل کو موجِ رنگ تیر کے خون
 لوتی تھی کس تکلف سے ہوا کے دوش پہ
 اماں ٹھنڈی ہوا کے گد گدائے کی اوا

مسندِ زریں پہ سترِ دہراں کے نہ فرے
 کاکلیں لہر رہی تھیں روئے عالیشان
 پھول تھے غرقِ عرف، پانی چوکھاتے تھے جام
 آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
 کیا ملاطمت تھاکہ میری کشتی امید میں
 غیب کے پردے آوازیں مبارک باد کی
 سامنے تھی جلوہ گاہِ کرسی و لوح و قلم
 ہر سخن میں گو بجتی تھی اسیمِ اعظم کی صدا
 وقت کے ہاتھوں پہ روشنی تھیں ابد کی شعلیں
 وہ ترنم تھاکہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے
 چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، ریڑھا، شراب
 نرگس، خورشید، آبِ آتشین و موجِ گل
 گردنِ بنا جھکاتے ہی اُبل پڑتے تھے جام
 وجہ میں تھی جھللاتی مشعلوں میں روشنی
 ناز کرتی جس طرح جاتی ہو گردوں پر دعا
 محفلِ نہر میں تھا ہنگامہِ قص و سرود
 میں بھی لافانی ہوں شل و چرب و آبِ حلا

تھے باندازِ حدیثِ دیگران کل رات کو
 صنیعتاں کا تھا گلِ پریاں کل رات کو
 سُرخ تھیں اس سُرخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو
 یوں لہلہاں گئے افسانہ خواں کل رات کو
 کاکلِ شہزادہ تھا یا بادباں کل رات کو
 آ رہی تھیں کاروانِ کارواں کل رات کو
 اک درِ بچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو
 نفس تھا آکِ حیاتِ جاوہاں کل رات کو
 ایسی اک منزل میں تھی عمرِ دہاں کل رات کو
 نہایت کی ہر شے تھی اک جنبشِ گراں کل رات کو
 چھٹا تھی تھیں ہم پر گنبدِ بیاں کل رات کو
 ہر طرف تھیں سُرخیاں ہی سُرخیاں کل رات کو
 گنگنا اٹھتا تھا یوں پیرِ مغان کل رات کو
 قص میں تھا پرتوِ طیلِ گراں کل رات کو
 اٹھ رہا تھا مشعلوں کیوں ہواں کل رات کو
 آسماں پر بچ رہی تھیں چڑیاں کل رات کو
 دل کچھ ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو

جوش کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی لہریں
 جیتا اک توہی تھا اسے رازِ دہاں کل رات کو

رباعی

آزادئی فکر و درِ حکمت ہے گناہ دانا کے لیے نہیں کوئی جاے پناہ
اس اثر درِ تہذیب کے فرزندِ رشید یہ مذہب و قانون، عیاذُ اللہ!

رباعی

دل ہوتا ہے رو براہ گاہے گاہے رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اس ڈر سے کہیں خم دی نہ بجاے خدا کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

رباعی

نوسیدی نظارہ انوار بھی جہل امیدِ شہود و شوق دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تکسہ سوال انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل

سرشکِ تبسم

اٹھاساغر کہ انساں کشتہ آلام ہے ساقی
یہ بریط ہے، یہ سے، آگے خدا کا نام ہے ساقی
نہ جانے نوعِ انساں کیوں جل سے خوف کھاتی ہو
اجل کہتے ہیں جس کو زحمت یکساں گام ہے ساقی

حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی
 فقط اک شکل ہے ساقی فقط اک نام ہے ساقی
 مساویں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر
 کہ اب تک نوعِ انساں بندہ اوہام ہے ساقی
 ادھر یہ قول ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی
 ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی
 ادھر شدت کے ساتھ اعلان ہے اتمامِ نعمت کا
 ادھر ہر سانس اب تک نہرِ کراکھ کا نام ہے ساقی
 کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہو
 سن کر کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی
 شکایت کیا کسی خوں ریز جنگیز و ہلاکو کی
 خود اپنا دل ہی جب خوں یز و خوں شام ہے ساقی
 عملِ کارستہ ہے جب سب ماحول و وراثت میں
 تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی
 جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی
 یہ کس آغاز کی سعیِ زبوں انجام ہے ساقی
 یکس کی مہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر
 کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ بر اندام ہے ساقی

لڑکپن صند میں روتا تھا جوانی دل کو روتی ہو
 نہ تھپ آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی
 تنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سُلائی ہے
 نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
 وہاں بھٹا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی
 جہاں موج ہوا تک مرغِ زیرِ دام ہے ساقی
 تبسم اک بڑی دولت ہو میں بھی اس کا قائل ہوں
 مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی
 جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں
 وہ آپ صاف بھی افشردۂ اصنام ہے ساقی
 ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوش کہتے ہیں
 کہ یہ اپنی صدی کا حافظِ ذخیرہ ہے ساقی

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خواہاں کیوں نہ ہو
 خاک ہوتا ہے تو خاک کو سے جاناں کیوں نہ ہو
 زیستِ اہرِ چپِ مستقل آوارہ گردی کا ہی نام
 عقل والا پھر طوافِ کو سے جاناں کیوں نہ ہو
 جب نہیں ستور یوں میں بھی گستاخوں گجرات
 دل کھلے بندوں غریقِ بحرِ عصیاں کیوں نہ ہو

جیب بشر کی دست رس سے دور چل استن
 دستِ وحشت میں پھر اک کافر کا داماں کیوں ہو
 ایک ہے جب شورِ جیل و باتگِ حکمت کا مال
 دل ہلاکِ ذوقِ گلبانگِ پریشاں کیوں ہو
 اک نہ اک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
 آدمی محوِ سجودِ سر و خواباں کیوں نہ ہو
 اک نہ اک چھندے ہی میں چھننا ہے جیبِ انسان
 دوش پر دامِ سیاہِ سنبھلتاں کیوں ہو
 جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو ای اہلِ خود
 لذتِ پیمانِ یارِ مستِ پیماں کیوں ہو
 اک نہ اک ظلمت سے وابستہ ہی رہنا ہے تو جوش
 زندگی پر سایہ زلفِ پریشاں کیوں ہو

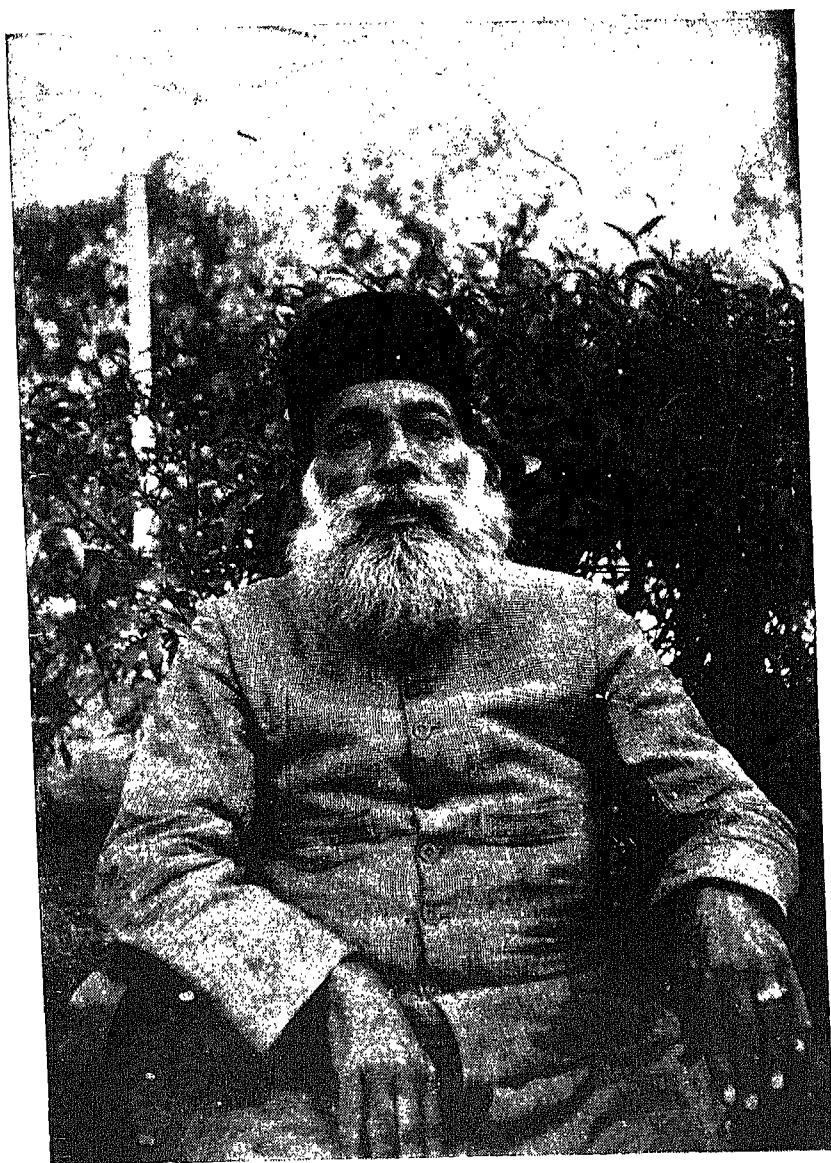
قدیم رنگِ نعل

سو زخم دیکھے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا	جا بٹخے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن انعطاف میں تیرا شکوہ	جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا
اسے میں سو جان سواس طرزِ حکم سے بٹا	پھر تو فرمائیے کیا آپ نے ارشاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد	اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت کے، کلی جیب چٹکی	جھکے میں نے کہا: کیا مجھ کو پھر ارشاد کیا

میری ہر سانس ہو اس بات کی شاہد ہو
میں نے ہر لطف کے موقع پر تجھے یاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
کچھ نہیں اس کے سوا جو سن حریفوں کا کلام
وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

حسرت موهانی

۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء



حسرت موهانی

سید احمد علی شاہ

گنجیہاں ماحول ہوا زندہ غنچہ سرا
 شعلہ ہر سب لکھا ہے سرا
 سکے نہ ہو در راہ ترنہ کیجا
 ایسے لکھنا نہ فرقت ہر سرا
 عقل و جان ہر لکھا جان را از ترا
 لکھیں دل دریا کی حریت سرا

لنگه دایه میست بهشتی را از کمر
دلو بگو خنک در جام که گریه آزاد
شتر گریه ما سزاوار از خمر حشرت

عنه اینی حرفی نیست بر کسین عاز کمر
شتر چنین ما بعد سمسد از کمر
از بنگ است از خوشی مرا کوفت کمر

[illegible]

میا کردن از میرزا که سوداگر است
 که مردن از خود کرد و از دست
 تو خست که میاید بهر کس که
 بدو حق خست از آنکه بهر کس که

اول بر زبان تو می گویم که من
 به تو می گویم که من
 به تو می گویم که من
 به تو می گویم که من

مقام لایحه در این باب - قیصر خرد

حسرت موہانی

سرگزشت

سید فضل الحسن نام، اور حسرت تخلص ہے۔ قصبہ موہان ضلع اناؤ
میں ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔

قرآن مجید اور اُردو فارسی کی تعلیم مولانا غلام علی موہانی وغیرہ سے
گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد اُردو بٹلک پاس کیا۔ عربی کی کتابیں
مولانا سید ظہور الاسلام، بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور، سے پڑھیں فتح پور
ہی سے انٹرنس پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا، اور علیگڑھ کالج میں
داخل ہو کر ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے، کی ڈگری حاصل کی۔

مولانا حسرت کا، درمیانی قد، معمولی نقشہ، گول چہرہ اور پتلا رنگ
ہے۔ ان میں اخلاق اسلامی قدما کی طرح جلوہ گر ہے۔ مزاج کی سادگی،
حوصلے کی بلندی، یقین کی استواری، حق پسندی، صدق و صفا اور
زہد و تقویٰ سے متصف ہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد رسالہ اُردوئے معلیٰ نکالا، جو دنیا سے
ادب و سیاسیات میں محتاج تعارف تھیں۔

ادبی و سیاسی مذاق ابتدائی سے نہایت صحیح اور سلیم ہے۔ شاعری میں تسلیم کھنوی کے شاگرد ہیں۔

باوجود چند در چند مجبوریوں کے وجاہت طلبی کی طرف سے مولانا نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، اور قومی خدمت گزاری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر، معاشرتی دنیا کو قانعانہ اور متوکلانہ طریق پر نہایت محدود و مختصر کر لیا ہے۔

مذہباً حنفی ہیں اور مشرباً قادری۔ بچپن میں شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت کی تھی۔ بعد ازاں اُن کے صاحبزادے سے، جو حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے والد ماجد تھے، تجدید بیعت کی۔ تقریباً آٹھ دس بار زیارت بیت اللہ شریف سے مشرف ہو چکے ہیں۔ مولانا نے اُردو لٹریچر کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، خصوصاً اُردو شاعری پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ اکثر غیر معروف شعرا کے حالات اور کلام سے لوگوں کو آشنا کیا، اور اس طرح بہت سے اساتذہ کے کلام کو تلفظ ہونے سے بچایا، شعرا کے تذکر مرتب کر کے شایع کیے، اور اُن کے کلام پر تنقیدیں لکھیں، جن سے پاکیزہ مذاق سخن کی اشاعت ہوئی۔

اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے وہی الفاظ استعمال کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جو عام طور پر رواج پانچکے ہیں۔

ان کے نزدیک غزل صرف عاشقانہ خیالات کے لیے مناسب ہے، دیگر مضامین کے اظہار کے لیے اسے استعمال کرنا زیبا نہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اشعار میں قافیہ نہ ہو تو چنداں مضائقہ نہیں، لیکن

ردیف کا ہونا از بس ضروری ہے۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

میر یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر، باز آ

نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جانیکا

تجھی کو چو یاں حبلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

معصی ترے کو پے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

مومن تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سیاست کی بدولت ان کو متعدد بار جیل میں رہنا پڑا ہے اور زنداں

کی صعوبتوں سے مستقل طور پر دو چار رہ چکے ہیں۔ لیکن ارادہ کا استقلال

اور خیالات کی استواری میں کبھی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ ایک بار جیل میں یہ

مطلع کہا تھا:

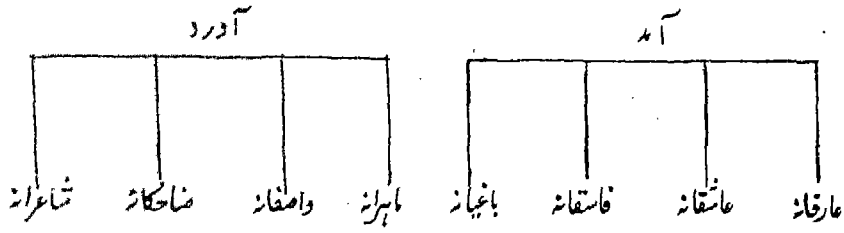
ہر مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

موصوف نے اپنا کلام سنانے سے قبل بطور تنہید ایک تقریر میں دیکھا

تغزل کو دو حصوں پر منقسم کیا، ”آمد“ اور ”آورد“، پھر دونوں کو چار

ابواب پر تقسیم کیا:-



اور مذکورہ بالا عنوانات کے تحت ہر ایک رنگ کے نمایاں غزل گو شعرا کے نام بتائے اور اسی ترتیب سے اپنا کلام تقسیم فرماتے ہوئے سامعین کو محفوظ فرمایا۔

انتخابِ کلام

منظرِ شانِ کبریا صلّ علی محمد
آئینہ خدا نما صلّ علی محمد
موجبِ نازِ عارفان باعثِ فخرِ صادقان
سرورِ و خیرِ انبیاء صلّ علی محمد
مرکزِ عشقِ دلکشِ امجدِ حسینِ جاں فزا
صدرتِ و سیرتِ خدا صلّ علی محمد
مونسِ دل شکستگانِ شہتِ پناہِ شنگار
شافعِ عرصہ جزا صلّ علی محمد

حسرت اگر رکھے ہے تو بخششِ حق کی آرزو

دردِ زباں رہے سدا صلّ علی محمد

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے
تنہا کی فصلِ بہار آ رہی ہے
حرم سے ہوا خوشگوار آ رہی ہے
دوائے دلِ بقرار آ رہی ہے
ترے کدہِ ملبوس کی دھجی دھجی
پے راحتِ جانِ کار آ رہی ہے
کہوں حال کیا اسکی جاں پر ری کا
جو کبے سے خوشنویز آ رہی ہے

ہوسِ دل کی اُن سے جدا ہو کے حسرت

سراسیمہ و اشکبار آ رہی ہے

میسر ہے شاہِ نجف کی عنای
زہے کامرانی زہے شادمانی
ملے مجھ کو بھی مثلِ سلمانِ بُوزر
وہی خواجہ تاشی وہی نیکنامی
یہ بخوفِ غم کیوں نہ ہوں گئے ہوں
حقیقت میں شیرِ خدا جسکے حامی
پہنچ کر درِ شاہِ مرداں پا کر
خصوصی شرفِ پاگئے ہم سہامی
نظر آئے ہولا کے روئے پر حسرت
عقیدت کے انوارِ حقِ شلِ حامی

دل میں نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی

آنکھ حیران کہ اک حُسن کی دنیا دیکھی
پیدے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح

چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
زلفِ شبرنگ پہ گلزارِ لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

نامرادوں کو شاد کام کرو	کرم اپنا کبھی تو عام کرو
کارِ عاشق ہے نامتام سو تم	قتل کر کے اُسے تمام کرو
سب کی خاطر کا ہر خیال تمہیں	کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
گھل سکے جب تلک نہ راہِ مر	منزلِ صبر میں قیام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو

تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

کرمِ ساقی میخانہ مبارک باشد	گرمی مجلسِ رندانہ مبارک باشد
عید ہے آج کا دن بادہ پر تنوں کیلئے	عشرتِ گردِ شِ پیمانہ مبارک باشد
جس کے دیدار کی مدتِ متناہی سواج	ہے وہی رونقِ کاشانہ مبارک باشد
دلفروشانِ تماشا کو بصدِ عیش و نشاط	وہ لبتِ جلوہ حبانانہ مبارک باشد

جانِ حسرت کے لیے مایہ نازش ہر ہی

اضطرابِ دل دیوانہ مبارک باشد

عشق میں خوفِ جاں سے در گزرے ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے

زندگی اپنی، ہو کے اُن سے جدا
 شامِ فرقت کٹی نہ جس کی رات
 زندگی ہے اسی کا نام تو ہم
 اُن کے قدموں پہ رکھ دیا سرِ شوق
 سخت گزرے گی اب اگر گزرے
 صبح گزرے نہ دوپہر گزرے
 ایسی در ماندگی سے در گزرے
 ہم یہ کیا بخودی میں کر گزرے
 منتظر ہے متاعِ حباں حسرت
 کہ اِدھر بھی وہ فتنہ گر گزرے

کوچہ اُس فتنہ دوراں کا دکھا کر چھوڑا
 پردہ ہم سے جو وہ کرتے تھے نہ کرنے پائے
 زہرِ اغیار میں بہرِ چند وہ بیگانہ رہے
 تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پردانہ رہی
 دل نے آخر میں دیوانہ بنا کر چھوڑا
 شوقِ بیاکٹے اُس کو بھی اٹھا کر چھوڑا
 ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
 سب کو دنیا میں تری یاد لگا کر چھوڑا
 مرگِ حسرت کا بہت بچ کیا آخر کار
 اثرِ عشق نے اُن کو بھی رلا کر چھوڑا

کچھ بھی حاصل نہ ہوا نہ ہر سوخت کے سوا
 دیکھا کوئی نہ دہری کے دساؤں کا جواب
 کون رکھے گا ترے غم سے دل و جاں کو غز
 حشر میں تابِ جہنم سے مفر اور کہاں
 شغلِ بیکار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا
 تیرے وارفتہ دیوانہ طبیعت کے سوا
 کچھ نہیں اور حیاں رنج میں راحت کے سوا
 اہلِ عصیاں کو ترے سایہِ رحمت کے سوا
 اوریاں خاک نہیں خواہشِ جنت کے سوا
 آپ نے تو نہ دیا کچھ بھی اذیت کے سوا
 کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا
 کچھ بھی حاصل نہ ہوا نہ ہر سوخت کے سوا
 دیکھا کوئی نہ دہری کے دساؤں کا جواب
 کون رکھے گا ترے غم سے دل و جاں کو غز
 حشر میں تابِ جہنم سے مفر اور کہاں
 نوبِ عرفان کی بحث ہی دلِ زاہد کو تلاش
 اس کی بات اور ہو پائیں جو ہم اس میں نہیں
 اہلِ ظاہر نہ کریں کوچہِ باطن کی تلاش

علم و حکمت کا جھنڈا شوق ہوا نہیں نہ ادھر کچھ نہیں فلسفہ عشق میں حیرت کے سوا
سب سے منہ موڑ کے اڑھی ہیں تیری یاد میں اس میں اک شان فراغت بھی راحت کے سوا

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا

کون سمجھے دل دیوانہ حسرت کے سوا

نگاہ یار جسے آشنا ہے راز کرے وہ کیوں نہ خوبی قسمت پہ اپنی ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا غافل آزاد ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گرد تیری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت

اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

یاد کرو وہ دن کہ تیرا کوئی سودا ہی نہ تھا باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشقِ روزِ افروز پہ اپنے مجھ کو جیرانی نہ تھی جلوہ رنگین پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی ملگی جب کہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا
کیا ہوے وہ دل کہ مجھ کو آرزو تھی حسنِ شوق ربط تھا دونوں میں گورِ ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی

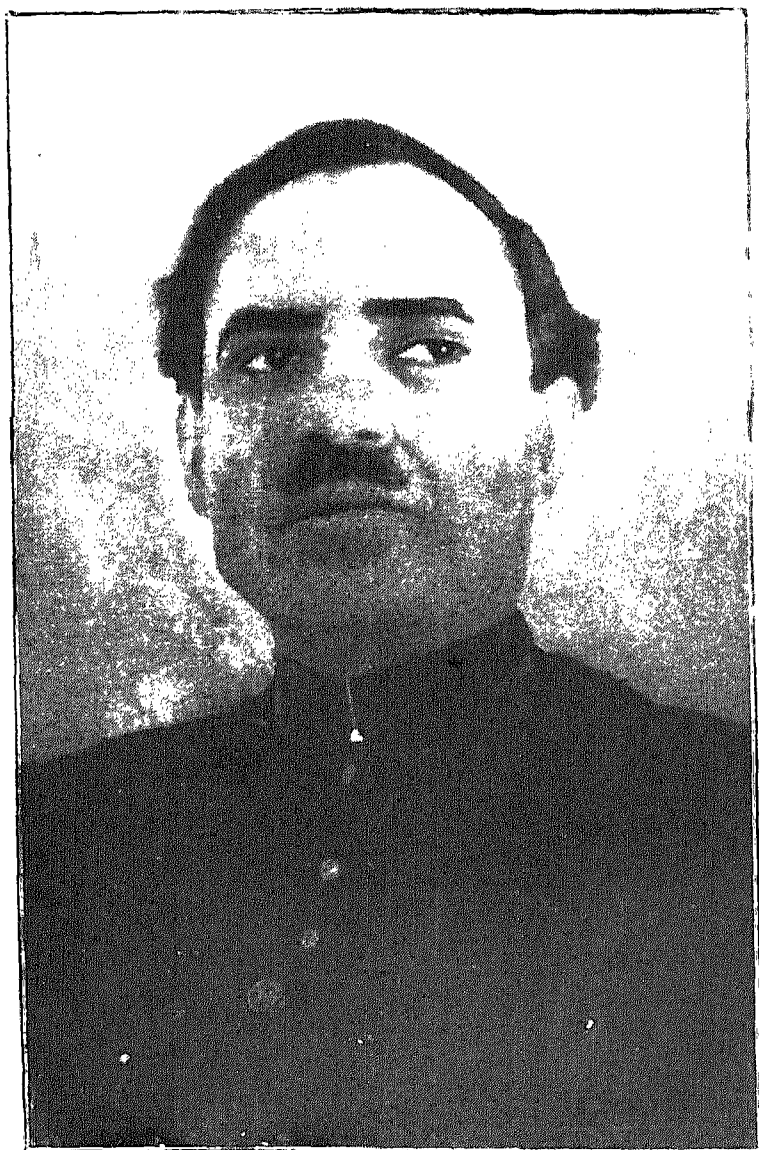
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

خفیط جالب دہری

۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء



حیدر علی خان



سفر نظامی

تو ہی بھر کا تو ہی سہارا
 پروردگار پروردگار
 شہرِ منور - اے اہل دنیا
 اللہ میرا باقی تمہارا
 یوں میرے جتنی الفت کی باتیں
 اک بار کھیلدے سو بار بار
 یہ نافرمانی اے اہل شر
 شہید کی دقت اور کٹار
 غفور و رحیم خدا ہر حق
 وہ بھی نہ پاس میں کہنی بار
 حقیقت باغِ ہدی

حفظ جالندھری

سرگزشت

محمد حفیظ نام، حفیظ تخلص، سن ولادت ۱۹۰۰ء، مقام پیدائش جالندھری
والد کا نام حافظ شمس الدین اور دادا کا حاجی مہر الدین ہے۔ ان کے اُٹا
ابو الاثر حفیظ کہہ کر پکارا کرتے تھے، اس لیے یہی نام مشہور ہو گیا۔ بعض ریاستوں
نے ”حسان الملک“ اور گورنمنٹ نے ”خان صاحب“ کے خطاب سے سرفراز
کیا ہے۔

تقریباً دو سو برس پیشتر ایک ہندو راجپوت خاندان مسلمان ہو گیا تھا
اور نقل وطن کر کے پنجاب میں آ بسا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس
خاندان کے ام آدمی احمد شاہ ابدالی کے مجاہدوں کے ساتھ مرہٹوں سے
جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ حفیظ اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔
سکھوں کے وقت میں ان کے خاندان پر خاصی تباہی آئی۔ انگریزوں
کے پنجاب پر قابض ہونے کے بعد ان کے دادا حاجی مہر الدین نے مع اپنے
بیٹائیوں کے فوج کے لیے بارود تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ یہی کام ان
کے والد حافظ شمس الدین بھی کرتے رہے۔ حافظ صاحب کو خدا نے

بہت سی اولادیں عطا کی تھیں۔ مگر حقیقت کے جوان ہوتے ہوتے پانچ بھائی اور چھ بہنوئی تھوڑے عرصے میں سپردِ خاک ہو گئے۔ حقیقت کو اپنے اہل و عیال کی کفالت کے لیے متعدد پیشے، اور تجارتیں کرنا پڑی ہیں اور انقلاباتِ زمانے کے ہاتھوں بہت سے تلخ اور خلافِ ضمیر تجربات حاصل ہوئے ہیں۔

جناب حقیقت درمیانی قد، گندمی رنگ اور کتابی چہرے کے مسکین طبع، اور کم گو انسان ہیں؛ باتوں میں سادگی ہے اور بیجا تکلف و تصنع سے دور رہتے ہیں؛ آواز میں سخن داد دی کے برکت شامل ہیں، جس سے حسنِ کلام دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

ابتداءً مسجد میں کلام مجید اور فارسی میں مکتبات، بوستاں تک پڑھی، بعد ازاں مدرسے میں ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے طبیعت کا میلان شعر گوئی کی طرف تھا، اس لیے مطالعہ کے ساتھ شعر گوئی بھی جاری رہی۔ اسی درمیان میں بقدرِ ضرورت انگریزی بھی پڑھ لی۔

ابتدائی کلام ملک الشعراء مولانا غلام قادر گیلانی کو دکھایا۔ آپ کے بعد نہ کسی سے اصلاح لی، نہ مشورہ سنا کیا۔

ان کا خیال ہے کہ شاعری میں نفسیاتی پہلو اہم ہے۔ یعنی وہ شاعری بہتر ہے جو انسان کو مادی اشیاء اور سفلی سطح سے بلند کر کے خود شناسی اور خدا ترسی کی طرف لے جائے۔

ان کی رائے ہے کہ ادبِ اُردو کی خدمت اس نہج سے ہونا چاہیے کہ سو فیصد مذاقِ باقی نہ رہے اور بلند خیالات روزِ مرہ کی زندگی

میں داخل ہو جائیں۔ نیز ایسے شاعروں کی قدر کی جائے جن کا فن فردو قوم دونوں میں عزت نفس اور باہمی رواداری کی تلقین کرے۔ وہ شعرا جو فحش مضامین نظم کرتے ہیں اور سفلی جذبات کو ابھار کر داولینا چاہتے ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی اچھے اور زندگی بخش ادب کو قتل کرنا ہے۔ کتابیں شائع کرنے والے ادارے اور انجمنیں اور کتابوں پر تنقید و تبصرہ کرنے والے حضرات ہتیا کیے جائیں، تو اُردو ترقی پاسکے گی۔

ان کا خیال ہے کہ ہندی و سنسکرت ہی نہیں بلکہ عربی و فارسی کے الفاظ کی بھرمار بھی اُردو کو نقصان پہنچائے گی۔ البتہ جو الفاظ پہلے سے گھل میں کر جڑو زبان ہو گئے ہیں، اُن کا استعمال زبان کا خُسر ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی ان کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔

شاعر کو اختیار ہے کہ موضوع کے لیے ضرورت سمجھے، تو قافیہ سے امداد لے، ورنہ حائل دیکھ کر ٹھکرا دے۔ چنانچہ یہ خود مرذف و مقفی اور بے قافیہ و ردیف دونوں قسم کے اشعار کہتے ہیں۔

دوسرے شعرا کے چند اشعار جو ان کو پسند ہیں، حسب ذیل ہیں۔

میر درد زندگی ہے یا کوئی طوفان سے

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اُٹی ہوئیں سب تدبیریں کچھ نہ دولے کام کیا

دکھیا اس بیمارِ خی دل نے آخر کام تمام کیا

تمناؤں میں اُبھایا گیا ہوں

کھوئے دے کے بلایا گیا ہوں

زندگی یوں بھی گزر رہی تھی کیوں ترارہ گزریا دیا

غالب

صفی

غزل اُس نے چھڑی مجھے ساز دینا

ذرا عسر رفتہ کو آواز دینا

گفتند جهان ما آیا تو می سازد

گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ بر ہم زن

اقبال

متقدمین میں تمیر کو اور متوسطین میں غالب، مومن اور آتش کو
 استاد مانتے ہیں۔ معاصرین میں مولانا سہا کو درجہ استادی دیتے ہیں،
 اور اقبال کو درجہ شاعر سے بلند سمجھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ معاصرین میں
 پورا شاعر میری نظر سے ادھیل ہے۔

تصانیف میں نظموں اور گیتوں کے دو مجموعے ”نغمہ راز“ اور
 ”سوز و ساز“ طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ”تلخایہ شیریں“ زیرِ طبع ہے۔
 ایک مثنوی موسوم بہ ”شاہنامہ اسلام“ تین جلدوں میں چھپ کر
 شہرتِ تام حاصل کر چکی ہے۔ اس میں سات ہزار اشعار ہیں۔ کچھ نظمیں
 ”تصویر کشمیر“ وغیرہ الگ الگ کتابی شکل میں بھی نکل چکی ہیں۔
 بچوں کے لیے ”بہار کے پھول“ ”پھول مالا“ ”ہندوستان ہمارا“
 ”حفیظ کے گیت“ اور دیگر نظمیں چار حصوں میں طبع ہو چکی ہیں۔
 اس وقت دہلی میں بسلسلہ ملازمت مقیم ہیں۔

۱۷۵ انتخابِ کلام

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
اگر وہ فتنہ کوئی فتنہ شباب نہیں
نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
مجھے ذلیل نہ کر غدرِ سن ترافی سے
سخن ہے نالہ دل نالہ رباب نہیں
تو حشر میرے لیے وجہ اضطراب نہیں
یہ اک نشہ ہے جو آلودہ شراب نہیں
یہ اہل ذوق کی توہین ہے جواب نہیں
میں کامیاب نہیں ہاں میں کامیاب نہیں
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں
خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جنابِ حقیقت

فقط زبانِ یہاں قابلِ خطاب نہیں

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے

نخلِ امید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے

دن ہو تو مہرِ جلوہ گر شب ہو تو انجمِ قمر

پردے ہی جب ہوں پردہ درو نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی موت نہ ہو تو خودکشی

یہ نہ کرے تو آدمی آحسہ کار کیا کرے

موت نے کس امید پر سوئپ دیے ہیں بحر و بر
 مشیتِ غبار ہے بشرِ مشیتِ غبار کیا کرے
 شمع بھی ہو رہینِ یاس، پھول بھی ہل اُٹاں
 کوئی نہیں ہے آس پاس، کچھ مزار کیا کرے
 گریہ شرم واہ واہ فردِ غسل ہوئی تباہ
 دیکھیے اک یہی گناہ روزِ حساب کیا کرے
 اپنے کیے پہ بار بار کون ہو روزِ شرمسار
 بل گئے عذر پائدار قول و قرار کیا کرے
 اہلِ نظر بھی ہیں بہت خیرِ نظر نہ آئے
 یہ تو مگر بتائے عاشقِ زار کیا کرے
 حدِ ہزن نہیں حقیقتِ تیرے خیال میں کوئی
 اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

دل ابھی تک جوان ہے پیارے	کس مصیبت میں جان ہے پیارے
رات کم ہے نہ چھٹیڑی محبت کی بات	یہ بڑی داستان ہے پیارے
جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں	یہ ہماری زبان ہے پیارے
تلخ کر دی ہے زندگی جس نے	کتنی میٹھی زبان ہے پیارے
جانے کیا کہہ دیا تنہا روزِ ازل	آج تک امتحان ہے پیارے
ہم ہیں بندے، مگر فقط تیرے	یہ ہماری ہی شان ہے پیارے
کب کیا میں نے عشق کا دعوے	تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا دشمنوں کا بیان ہے پیارے
 تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ ہر زمیں آسمان ہے پیارے
 ساری دنیا کو ہے غلط فہمی مجھ پہ تو مہربان ہے پیارے
 بزم ہے، احتراز ہی کیا ہے پردہ سادرمیان ہے پیارے
 عرض مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا
 یہ تو اک داستان ہے پیارے

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوے پانی کی جھیل
 یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل
 کوئی لہر اٹھتی نہیں اس بحر جبرت جوش میں
 بزمِ انجم غرق ہے موسیقیِ خاموش میں
 کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوں انگیز ہے
 جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی رہ رہے
 رات کے افسون میں گم ہو گئی ہے کائنات
 یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات
 شہ درے کے ”نوحہ خواں“ مینا بھی خاموش ہیں
 مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں

اس طرف سایے کو پٹائے ہے پل سویا ہوا
 چاندنی پر ریت کا ہے جزو کل سویا ہوا
 اُس طرف اجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
 اک گئے گزرے پُرانے خواب میں مدہوش ہے
 اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
 کر دٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و ناامید
 سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
 اور ہوا کیا ہے، لبِ راوی پہ آہ سرد ہے
 نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
 جس طرح اک طفل سو جاتا ہر ماں کی گود میں
 چاند بالائے فلک ہے چاند زیرِ آب ہے
 چاند بھی ساکن ہے لیکن چاندنی بیتاب ہے
 چاند کو گھیرے میں لے کر بہ رہی ہے چاندنی
 کوئی خواب آور کہانی کہ رہی ہی چاندنی
 اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں
 خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں
 یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
 میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں

اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چھکے چھکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ

میری کشتی کے جلو میں کیوں چلے آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انھیں

آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انھیں

دورِ آفاق پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے

زندگانی کا رخ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں جاں

حسرتیں امید کے جلوے دکھاتی ہیں جاں

پھر آگیا کوئی رُخ زیبائے ہوئے

اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشائے ہوئے

بیٹھا ہوں زریبِ تنہائے ہوئے

اُٹھا تو ہے خدا کا سہارا لیے ہوئے

اک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لیے ہوئے

یہ کون جا رہا ہے تنہائے ہوئے

دُنیا کھڑی ہے دولتِ نیا لیے ہوئے

میرے خیال و خواب کی دنیا لیے ہوئے

پھر دل میں آ بسی ہو کسی انجمن کی یاد

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر

دل کیسوے بتاں ہیں اُلجھ کر نہ گر پڑے

اُس فتنہ شباب کا عالم نہ پوچھے

حسرت برس رہی ہے رُخِ نامراد پر

آئی ہے بے جا مرامِ ایمان ٹوٹنے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حقیقت

پھر تاہوں اک جہان کا شکوہ لیے ہوئے

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ کام دیوتا فتنہ ہمارے نو جگا

بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا

سرد ہو گئی ہے آگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

پڑ گئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا

پرتھوی پہ چاکھونٹ ایک سوگ پڑ گیا

سزنگوں ہے شیش ناگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی

حُسنِ خود پسند کی دن سے رات ہو گئی

زرد پڑ گیا سہاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہ زنی
 کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
 اب لگاؤ ہونے لاگ
 جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

اے مغنی شباب جاگ خواب ناز سے
 دل شکستہ ہے رباب عرصہ دراز سے
 مر گئے قدیم راگ
 جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشمِ دا کرے ہر امنگ جاگ اٹھے
 آہ و نالہ جاگ اٹھے راگ و رنگ جاگ اٹھے
 جوگ سے ملے بہاگ
 جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

پھر اُسی اٹھان سے تیر اٹھے کمان سے
 صبر کی زبان سے شورِ الاماں اٹھے
 جاگ بھین لوں کے بھاگ جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ اے نظرِ روزِ جاگ اے نظرِ نواز
 جاگ اے زمانہ سوزِ جاگ اے زمانہ ساز
 جاگ نیند کے تیاگ
 جاگ سوزِ عشق جاگ

یہ مال پُرانا ہے

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سُہانا ہے
 افسوس مجھے نیند آئی ہے، افسوس مجھے اب جانا ہے
 اک روز مجھے اُس کو چومیں، ناصح کو لے جانا ہے
 کچھ دل کو راہ پہ لانا ہے، کچھ دُسر کو سمجھانا ہے
 معصوم انگلیں جھول رہی ہیں دلِ داری کے جھولوں میں
 یہ کچی کلیاں کیا جانیں، کب کھلنا کب مڑ جانا ہے
 دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
 بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آئینہ بن کر بہ جانا ہے
 بازارِ دنیا کا کب بھی سنئے اب جنسِ وفا کی قدر نہیں
 بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پُرانا ہے
 اے طائرِ جاں کچھ روز ابھی اُڑنے کی ہوس میں رہتا ہوں
 اس تنگ قفس میں رہنا ہے، دیکھ سنا ہے، غم کھانا ہے

اگر کوئی بے نقاب کر دے

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
 مرے خیالوں میں رنگ بھر دے، مرے لب کو شراب کر دے
 حقیقتیں آشکار کر دے صداقتیں بے حساب کر دے
 ہر ایک ذرہ یہ کہہ رہا ہے کہ آج بھئی آفتاب کر دے
 یہ خوب کیا ہے، یہ زشت کیا ہے، جہاں کی اصلِ رشت گیتا
 بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے
 کہو تو رازِ حیات کھدو، حقیقتِ کائنات کہ دوں
 وہ بات کہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آبِ آب کر دے
 خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
 پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے
 ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
 مری خطائیں شمار کر لے، مری سزا کا حساب کر دے
 حقیقت سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
 کسی کی دنیا تباہ کر دے کسی کی عقبی خراب کر دے

رضا الکفوی

۲۳- مارچ ۱۹۴۱ء



رضا آلمه‌نوی

10

11

12

13

14

15

16

17

18

میاں خوشیوں کی رنگ تمام ہری

کبھی صبح ہری اور حسین شام ہری

تقارن عشق! لبر اسیر جھکا، تندر تندر

ادھر سے تیر سے بہت کلام ہری

ہر ایک اپنی جگہ خوش، ہر کبھی کبھی

نگاہِ خاطر بطورِ نگاہِ عام ہری

لبر اتروا تیرے محبت کا لیلیا بدل

سمات کرنا، جو لکھنؤ اشقام ہری

ہے دیکھتے ہی کا، رتن جسے سمجھتے میر

رضا، وہ دعویٰ چری دیں دھلا کر سام ہری

۱۱/۱۲/۲۰۲۱

رضا لکھنوی

سرگزشت

سید آل رضا نام، رضا تخلص، والد کا نام (خان بہادر) سید محمد رضا، سال ولادت ۱۸۹۶ء اور مقام پیدائش قصبہ نیو مٹی اناؤہر۔ رضا جب پیدا ہوئے، ان کے والد عمدہ منصفی پر مامور تھے۔ اس کے بعد اوردھ کے اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عمدہ ہائے جلیلہ پر مامور رہے۔ آخر میں چیف کورٹ لکھنؤ کے جج ہو گئے تھے۔

عبد طفلی والد کے ساتھ مختلف اضلاع میں گزرا، لیکن زیادہ تر تعلیم سینا پور میں ہوئی اور یہیں سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۱۶ء میں کینگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کیا، اس کے بعد خانگی امور اور دیگر مصروفیتوں کے سبب سے دو سال بیکار گزرے۔ ۱۹۱۸ء میں قانون پڑھنا شروع کیا، ۱۹۲۰ء میں الہ آباد سے ال، ال، بی کا امتحان پاس کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔ تھوڑے عرصے کے بعد لکھنؤ سے پرتاب گڑھ جاکر وکالت کرنے لگے۔ وہیں خان بہادر نواب احمد حسین صاحب او، بی، ای، رئیس و تعلقدار، پریانواں ضلع پرتاب گڑھ

کی دختر سے شادی ہو گئی۔

جنابِ رضا صوم و صلوة کے پابند اور ورد و وظائف کے عادی
لکھنوی وضع کے خوش پوش، خوبصورت، خوب سیرت، خندہ پیشانی
خوش رنگ اور موزوں اندام انسان ہیں۔

ان کی شاعری کا آغاز پرتاب گڑھ سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں
خاص اہناک نہ تھا، کبھی کبھی کچھ شعر کہ لیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء
میں اجاب کے اصرار پر باقاعدہ غزل کہنا شروع کی اور سید انوار
حسین آرزو لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا۔ کیسر تعلقان
ہے کہ استاد سے ملنے کا کبھی موقع نہ ملا۔

شاعرانہ حیثیت سے پرتاب گڑھ ہی میں شہرت پہنچی تھی۔ ۱۹۲۶ء
میں پرتاب گڑھ سے لکھنؤ آئے، تو یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس
گرم تھی۔ انھوں نے بھی ان محفلوں میں حصہ لینا شروع کیا، اور
مختصر عرصے میں اپنے ادبی رُتبے کو متوالیا۔ چنانچہ اس کے عقربان
میں انجمن معین الادب نے، جس کے ممبر جناب صفی اور حضرت
ظرفیت بھی تھے، ان کو نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا اور بعد
ازاں صدارت کے فرائض تفویض کر دیے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ انجمن
”بہارِ ادب“ کے نام سے موسوم ہوئی، تو اس میں سکرٹری کی
حیثیت سے کام کیا۔

فرماتے ہیں کہ ”میں زیادہ تر جذباتی شاعری کرتا ہوں، جس میں
روحانیت کا خاصا حصہ ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کی دنیا کو یہیں تک
محدود نہیں سمجھتا۔“

اُردو ہندی کے الفاظ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ
 ”زبان ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتی۔ شاعر کو اپنے خیالات زمانہ کی
 زبان کے لحاظ سے عام فہم طریقے پر ظاہر کرنا چاہیے۔ لیکن نوعیت
 مضمون کے لحاظ سے کبھی اس کچلے سے الگ بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ اُردو
 زبان میں بکثرت ہندی الفاظ رائج ہیں۔ ایسے الفاظ کا سلسلے سے
 استعمال اچھی صورتیں پیدا کر سکتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں صرف
 معنویت کا لحاظ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ آواز، وزن، اور مزاج کی ہم آہنگی
 بھی لازمی ہے۔“

تردیح اُردو کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ضروریات زندگی
 اور لوازمات ترقی پر نظم و نثر شائع کر کے عوام تک اس طرح پہنچانا
 چاہیے کہ انھیں کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ مطبوعات کی
 خریداری اور اہم سے اہم فائدہ کا حصول ممکن ہو۔
 ردیف و قافیہ کے متعلق خیال ہے کہ اکثر غیر مرادف اشعار بھی
 کافی لطف دیتے ہیں، لیکن قافیہ اور ردیف دونوں سے معراشتاً
 بہت پھیکے ہوتے ہیں۔

رضا کو غالب اور میر کا کلام بہت زیادہ پسند اور یاد ہے۔
 نظم میں نظیر اکبر آبادی اور انیس کو، اور غزل میں غالب،
 آغ، موئن، اور آرزو کو استاد مانتے ہیں۔
 ایک مجموعہ کلام ”نوائے رخصتا“ کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

انتخابِ کلام

اللہ، نظر کوئی ٹھکانا نہیں آتا
کہدوں تو مزے پر یہ فسانا نہیں آتا
یہ تیرا کرم ہے کہ کبھے جاتے ہیں جلوے
بے سمجھے وہی ہوش میں دیتے ہو ٹوکے
میں شیشہ و ساغر کو تکوں جبکہ یہ سمجھوں
یوں روز ہوا کرتے تھے بیاختہ چکر
تدبیر سی تدبیر و عاؤں سی عائن
مقدور تھا بس ایک ہی سجدہ ترور دے
آنے کو چلے آتے ہیں جانا نہیں آتا
ٹھہروں تو پلٹ کر یہ زمانا نہیں آتا
مجھ کو تو نظر تک بھی اٹھانا نہیں آتا
جاؤ تمہیں دیوانہ بنا نا نہیں آتا
ساتی تجھے چلو سے پلانا نہیں آتا
اب آج بکایا ہے تو جانا نہیں آتا
سب آتا ہے تقدیر بنا نا نہیں آتا
سر میں نے جھکایا ہے اٹھانا نہیں آتا

آتی ہر رضا مجھ کو محبت کی غلامی

احسان محبت کا جتنا نہیں آتا

خیال حسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
وقارِ عشق بس اب سر جھکا دے قد پر
ہر ایک اپنی جگہ خوش ہرک یہی سمجھا
نظر ملی تو قسم رہا خسوشی پر
بس اب تو تم نے محبت کا لے لیا بالہ
معاف کرنا جو تکلیف انتقام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی
اُدھر سے تیرے لیے بستی سلام ہوئی
نگاہِ خاصِ طبر زنگاہِ عام ہوئی
نظر پھری تو ذرا ہمتِ کلام ہوئی
معاف کرنا جو تکلیف انتقام ہوئی

ہر دیکھنے ہی کا وقفہ جسے سمجھتے ہیں

رضا وہ دھوپ چڑھی دن ٹھلاؤ شام ہوئی

اپنا لیا اُسے چہن روزگار نے میرے لیے یہ پھول کھلایا بہار نے
 ہر دم نئی ادا سے وہ آتے نظر ٹپے آنکھوں سے کتنے کام نئی تظار نے
 رپح رپح کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روز پھول
 جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

واسطہ کوئی نہ رکھ کر بھی ستم ڈھاتے ہو تم
 میری سبک زادیاں بندہ نوازی پر نثار
 لاتے ہو کیفِ طرب دیتے ہو پیغامِ حیات
 اس طرح چھپتے ہو جلووں کی فراوانی کیسا
 سن کے میرا حال ہیں آنکھیں نہ ملنے کے وجہ
 بھیج کر خوشبو ہواؤں میں باندازِ پیام
 دلگداری بھی لیے ہے امتیازِ حسن و عشق
 چاند میں رنگت تمھاری پھول بھی تم سے بے
 تم سے ہے آراستہ جذبات کا تازہ چہن
 دل تڑپاٹھتا ہر اک بار ہے کو یاد آتے ہو تم
 اے خوشا قید و فائز بخیر پہناتے ہو تم
 کیا بتاؤں ساتھ کیا لیکر چلے جاتے ہو تم
 میں سمجھتا ہوں کہ جیسے سامنے آتے ہو تم
 یہ بھی ہو سکتا ہے شاید اشک بھرتے ہو تم
 کیا یہ سچ ہے آج یوں میری طرف آتے ہو تم
 خون رو دیتا ہوں میں اشک پانی چاتے ہو تم
 کھینچتی ہیں دل فصائیں یاد آ جاتے ہو تم
 جیسی رُت ہوتی ہو گیا پھول بجاتے ہو تم

ذکر اس کا ہے رضانے کیں وفائیں یا نہیں
 تم نے آخر کیا کیا کا ہے کو شرماتے ہو تم
 دل کا ٹکڑا کوئی ہر لفظ میں شامل ہو جائے
 انتظار اور جدائی کا سلسلہ یہ پیام
 ذکرِ حس کا ہے ذرا اُس کے بھی قابل ہو جائے
 جان بھی جاتی ہوئی رات میں شامل ہو جائے
 چاہتا ہوں کہ طبیعت متمل ہو جائے
 کون کتا ہے جفاؤں پہ جھائیں نہ کرو

آپ کے ہاں یہ پھول جو ہے دل کے قریب
اس سے کہیے کہ جب اُترے تو مراد دل ہو جائے

اُس پر ظالم نیت نئی تیا ریاں	حُسن کی فطرت میں دل آزاریاں
پھول اٹھیں اک پھول میں پھول ریاں	سادگی میں آگتیس دل داریاں
خواب کے آغوش میں بیداریاں	متصل طفلی سے آغازِ شباب
درد مندوں کی وہ غیرت داریاں	چارہ سازوں کی وہ قاتل غفلتیں
کھوئی جاتی ہیں مری خود داریاں	بس ہجومِ شوق اب اس بھیر میں
بے ارادہ ہوتی ہیں تیا ریاں	سوچ کر اُن کی گلی میں جاؤ کون
چھوڑیے بھی اب غریب آزاریاں	اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے
یا بڑھاتے جاتے ہو دشواریاں	سہل کرنے آئے تھے مشکل مری
ایک بیماری کی سو بیماریاں	دردِ دل اور حبانِ لیوا پریش
اللہ اللہ اتنی خاطر داریاں	اور دیوانے کو دیوانہ بناد
مدبھری آنکھوں میں رنگیں دھاریاں	کھینچتی ہیں خطِ موجِ شراب
ہاے دُنیاؤں مری دُنیا داریاں	عشق اور ضدیں یہ رسمِ وراہ کی

بندھ رہا ہے اے رضا رختِ سفر
ہو رہی ہیں کوچ کی تیا ریاں

آنکھوں میں چمک جائیں کہ دیوانہ بنائیں

کیا ہوں وہ منتائیں جو دل میں نہ سائیں

اللہ رے آغازِ محبت کی فضائیں

باتوں میں، نگاہوں میں، خیالوں میں ادائیں

کیا وعدہ بہیم پہ رضا اس لگائیں

آج آئیں کہ کل آئیں، وہ آئیں کہ نہ آئیں

پھیرے مری تقدیر میں ہیں اُن کی گلی کے

یہ حُسنِ قبول اُن کا بلائیں نہ بلائیں

رہنے دیں یہی اس کہ کُجھ جائیں گے آنسو

دل توڑنے والے ابھی دامن نہ چھڑائیں

تمہارے دیے تھے تمہارے لیے ہیں

میں پابندِ الفت مرے لب سے ہیں

نہ معلوم مر مر کے کیوں کر جیے ہیں

وہ دامن ابھی ہاتھ ہی میں لیے ہیں

ستم کر رہے ہیں، کرم بھی کیے ہیں

مرے ساتھ وِداک قدم ہو لیے ہیں

ہمیں کتے کتے کبھی رو لیے ہیں

جو تم ہو مرے، سب یہ میرے لیے ہیں

یہ کیا کم ہے تھوڑا سہارا دیے ہیں

وہ آنسو چہنہن ہنس کے ہم نے پیے ہیں

کریں وہ جو چاہیں کہیں وہ جو چاہیں

تمہارے ہی رحم و کرم کے سہارے

بڑی دیر تک جس سوپ کچھ تھے آنسو

اسے میں ہی سمجھوں گا میں ہی جانوں

کہاں پائے نازک کہاں راہِ الفت

ہنساتا ہے سب کو ہمارا فسانہ

گل و باغ و غم، مہ و مہر و خشم

اُٹھاتے وہ کیوں مل کے بارِ محبت

بھلے ہیں، بُرے ہیں، کسی سو غرض کیا

رضا وہ بہر حال میرے لیے ہیں

جو خود نہ اپنے ارادے سے بدگماں ہوتا قدم اٹھاتے ہی منزل پہ کاڑاں ہوتا
 فریب دے کے تغافلِ بالِ جاں ہوتا جو اک لطیف تبسم نہ درمیاں ہوتا
 دماغِ عرش پہ ہر تیرے در کی ٹھوکر سے نصیب ہوتا جو سجدہ تو میں کہاں ہوتا
 قفس سے دیکھ کے گلشنِ ٹپک پڑے آنسو جہاں نظر ہے یہاں کشتِ آشیاں ہوتا
 ہمیں نے اُن کی طرف سوتا لیا دل کو وہ کرتے عذر تو یہ اور بھی گراں ہوتا
 سمجھ تو یہ کہ نہ سمجھے خود اپنا رنگِ خوبا مزاج یہ کہ زمانہ مزاجِ داں ہوتا
 بھری بہار کے دن ہر خیالِ ہی گیا اُجڑ نہ جاتا، تو پھولوں میں آشیاں ہوتا

حسین قدموں سے لپٹی ہوئی کشش تھی جہاں

وہیں تھا دل بھی رضا اور دل کہاں ہوتا

رُوشِ صِدِّیقِی

۱۳- اپریل ۱۹۳۱ء



روش صديقى

اب مالم تھائی پنہاں کچھ اور ہے
 ہر لمحہ اضطراب سما منڈاں کچھ اور ہے
 ہے یوں تو ہر نشاط تہہ برس ماشتاق
 لیکن اشارہ عم جاناں کچھ اور ہے
 یہ داستان ہنسی رخ دگیو پہ منحصر
 انسانہ محال سما منڈاں کچھ اور ہے
 ہر چہند ، جام مرگ بھی ہے راتِ آفریں
 اسے دروِ زندگی ترا بند ڈرناں کچھ اور ہے
 الطاف بر ملا کی تو کیا بات ہے ، مگر
 رعنائی تو از شش پنہاں کچھ اور ہے
 بیابانی خسرو ہے نہ بیابانی دکنوں ،
 اسے دوست ! راہِ چاک گریباں کچھ اور ہے
 زائد ! ترا لہن ایاں بھی ہے لمبہ
 لیکن مرا تصورِ آریاں کچھ اور ہے
 برحق سرت سردماں ، مگر دشت
 لطفِ حیات ہے سروشاں کہ لہ ہے



دش مسک

مصطفیٰ آباد رابپور ۱۳۶۱ھ
 ۱۵ — ریح اللہ ۱۳۶۱ھ

روشِ صدیقی

سرگزشت

شاہد عزیز نام، روش تخلص، اور ۱۰ جولائی ۱۹۷۷ء تاریخ پیدائش ہو۔
والد کا نام مولوی طفیل احمد شاہد، اور مولد و مسکن جوالا پور (سہارنپور) ہو،
جو مناظرِ فطرت کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور خود ان کے بقول ”قدیم
ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ ہو“

قرآن مجید اور اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سنسکرت، ہندی
اور انگریزی سے خود واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ سات سال کی عمر سے
شعر کہتے ہیں اور اس فن میں اپنے والد سے تہذیب سے ۲۲ء تک برابر
غزلیں لکھیں۔ اس کے بعد نظم نگاری شروع کر دی ہے۔

رہش پستہ قد، گندمی رنگ، کتابی چہرے اور خوبصورت آنکھوں
کے مہنس نگہ نوجوان ہیں، اور خلوص و محبت اور صدق و صفا کی
تصویر نظر آتے ہیں۔

ان کو دیگر اساتذہ کے یہ چند اشعار پسند ہیں:-

دل چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن غالب
بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

غالب

رگوں میں دوڑتے پھرنے سے ہم نہیں قائل
 جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے
 بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدلی
 وہ اک نگہ جو لپٹا ہر نگاہ سے کم ہے

انتخابِ کلام

چشمہ شاہی - سری نگر کشمیر

کس نے جہانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
 صبح کے چاکِ گریباں کو خبر ہو شاید
 زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
 آگئی حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
 کیوں یہ پیشانی احساسِ جھکی جاتی ہے
 حیرتِ عالمِ امکاں کو خبر ہو شاید

کس کے آنچل کی جھلک تھی یہ کوئی راز نہیں
 کیا یہ روپوشی انداز ہی غماز نہیں

شوق کو پردہ غفلت نہ بنا اے محبوب
 اس رہ و رسمِ قدامت کو اٹھا اے محبوب
 نہ محبت کو محبت سے چھپا اے محبوب

عشق مدہوش سہی غافل آغا نہیں

کچھ خبر ہے تجھے اے موجِ حجابِ آرائی
 اب کہاں ہے مری آوارگی و رسوائی
 ہر طرح اب دلِ محروم سکوں ہے رسوا
 ہر خوشی سے بدائی کافوں ہے رسوا

عشق حیراں ہے فرد چپ ہر جُنوں ہے رسوا
زندگی ہے کہ کوئی قافلہ تنہائی

تھک کے بیٹھا ہوں سہرا گزرتیرے لیے
بن گیا گردِ رُخِ شام و سحر تیرے لیے
میں ترا خواب ہوں آنکھوں میں بسا لے مجکو
میں ترا درد ہوں سینے سے لگا لے مجکو
میں ترا عکس ہوں دامن میں چھپا لے مجکو
میں تو صدیوں سے ہوں سرگرم سفر تیرے لیے

آرزو کیا غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
درد کیا تلخ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک مایوسی پیہم ہے غماں گیسر و فنا
خود بخود ٹوٹ نہ جائے کہیں زنجیر و فنا
دور جاتے ہوئے کچھ خواب ہیں تعبیر و فنا
جیسے کونین ہیں وقت کے سوا کچھ بھی نہیں

شعلہ زلیست ہر محروم پیش میرے لیے
مرگ و ہستی میں نہیں کوئی کشش میرے لیے
شہد کی طرح بہت زہر پیا ہے میں نے
غم پہناں کو بہت پیار کیا ہے میں نے
داغ دامن پہ نہیں دل پہ لیا ہے میں نے

جیسے دنیا میں تھی ہر ایک غلش میری لیے

انقلابات سے ہمدوش رہا ہوں برسوں

خالقِ تکنت ہوش رہا ہوں برسوں

سی دیا ہے کبھی انجسم کے گریبانوں کو

کبھی چھپڑا ہے گرجتے ہوئے طوفانوں کو

کر دیا خواب کبھی دہر کے افسانوں کو

خرد افروز و جنوں کو ش رہا ہوں برسوں

کر دیا چاک نقابِ رُخِ آلام کبھی

صبحِ اسکاں کو کیا منتظرِ شام کبھی

مگر احساسِ جدائی کو حُبِ داکر نہ سکا

وقت کو دایم تعین سے رہا کر نہ سکا

دہر پھر بھی مجھے بیزارِ وفا کر نہ سکا

تجھے بھولا نہیں میرا دلِ ناکام کبھی

یہ مری روح ہے یا حسرتِ نظارہ ہے

دلِ مرا اک ابدی شوق کا گہوارہ ہے

کہیں ہو جائے نہ پامالِ طلبِ عشقِ مرا

بھول جائے نہ کہیں راہِ ادبِ عشقِ مرا

خود فراموش ہوا جاتا ہے اب عشقِ مرا

ہر نفسِ شنہ و وارفتہ دآوارہ ہے

کیا تری آنکھ بھی میرے لیے بے خواب نہیں
 نرگس نازیں بھی شبنم شاداب نہیں
 کیا وہی عالم فردا کے وفا ہے اب بھی
 کیا وہی انجمن حیر نما ہوا اب بھی
 کشر دل کشر دل سے خفا ہوا اب بھی
 تو بھی کیا اپنی روش کے لیے بتیاب نہیں

ختم یکشمکش و ہم و گماں کب ہوگی
 دور یہ ظلمتِ شبہائے خزاں کب ہوگی
 کیا کوئی دورِ جاباں ابھی باقی ہے
 کوئی اسکانِ محال ابھی باقی ہے
 کیا جدائی کی کوئی رات ابھی باقی ہے
 زندگی کی ابدی صبح عیاں کب ہوگی

آہ! کہ اب شمعِ جدائی کو بجھا دیں اور دست
 یہ جو اک پردہ آخر ہے اٹھا دیں اور دست
 کھو نہ حبا میں کہیں طغیانِ فراموشی میں
 غم کہیں ڈھونڈ نہ لے وادیِ خاموشی میں
 پھینک دیں روح کو فردوسِ ہم آغوشی میں
 زندگی کو ابدی خواب بنا دیں اور دست

بیداری مشرق

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب
وقت آیا ہے کہ اٹھ روئے گیتی سے نقاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

اے جمالِ شمعِ آزادی کے پروانو، اُٹھو
سوچکے اے قصرِ ملت کے نگہبانو، اُٹھو
بادہ بیداریِ مشرق کے ستارو، اُٹھو

اب جگا بھی دو بہت کچھ سوچکا ہے آفتاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زندگی تابندگی ہے روحِ آزاد کی ساتھ
زندگی پائیدگی ہے روحِ آزاد کی ساتھ
زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزاد کی ساتھ

زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کب تک اجتناب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

نوجوانو، اب نشاطِ کینجِ تنہائی کہاں
اے شجاعو، تم کہاں یہ فکرِ پائی کہاں
بچونک و محفل کو وقتِ محفل آرائی کہاں

توڑ ڈالو ساغر و سپاہ و چنگ و رباب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زیست کی قیمت ہی کیا ہے پیشِ مردانِ وفا

کوئی پوچھے کہ بلا سے رازِ سپاہِ وفا

ہاں دکھا دو، اے شجاعو، جوشِ اربانِ وفا

بے حدود و بے کنار و بے شمار و بے حساب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

اب بھی آنکھوں میں تمہاری رنگِ غفلت دیدہ،

خوابِ مستقبل کی ہر تعبیرِ ناپوشیدہ ہے

انتظارِ صبح کیسا، صبحِ خودِ خوابیدہ ہے

تم ہی خود بڑھ کر آلٹ دو مہرِ زریں کا نقاب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

سُرخِ خونِ وفا سے زندگی بریز رہے

غیرتِ فرد و برقِ خرمنِ پرویز ہے

جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتشِ خیر ہے

ہاں وہی ہکا مران و کا مگار و کامیاب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

درِ ملت کے لیے ملت کے غمِ خوار و چلو

اے شجاعو، اے دلیرو، اے رضا کار و چلو

نقصر ہے رحمتِ یزداں مونسِ دار و چلو
یوں ہی کھل جاتے ہیں اکثر قصرِ آزادی کے باب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

برق ہو آنکھوں میں، دل میں آتشِ پروانہ ہو
خامشی میں جرأتِ بیدار کا افسانہ ہو
نوجوانو! اب تو ہر اندازِ بے باکانہ ہو
زندگی کب تک اسیرِ اعتکاف و احتساب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

شرم آئے اپنی ناکامی پہ استبداد کو
اب نہ صیادی کی جرأت ہو کسی صیت کو
تیز کرد و شعلہ ہاے فطرتِ آزاد کو
بجلیوں سے چھین لاؤ اشتغال و اضطراب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

آسمانِ سرفروشی کے ستاروں کی قسم
تم کو ناموسِ وطن کے جاں نثاروں کی قسم
پاکبازوں کی قسم، شبِ زندہ داروں کی قسم
جاگ اٹھو و مکیو گے کب تک لہنی امیدوں کے خواب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

سہے بہت اونچا وطن پر مرنے والوں کا مقام

جاں نثارانِ وطن میں وارثِ دارالسلام
 یہ وہ منزل ہے کہ جس میں ناامیدی ہو حرام
 ہو نہیں سکتا کبھی عزمِ وفا کا میاں
 انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرقِ انقلاب
 ہوشیار اے غافلانِ حالِ بربادِ وطن
 ڈھونڈتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن
 گر ہوا اب بھی نہ تم کو پاسِ فریادِ وطن
 ایشیا کا ذرہ ذرہ تم سے مانگے کا جواب
 انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرقِ انقلاب

شاہِ معصوم

بھول جا اے شاہِ معصوم مجھ کو بھول جا
 محفلِ آرا سے وفاتو، اور میں ننگِ وفا
 دل مرا تارِ یک ہے تو بحرِ انوارِ وصیا
 پست ہے منزلِ مری اور تو ہو فطرتِ شینا
 نور تیری ابتدا ہے خاکِ میری انتہا
 بھول جا اے شاہِ معصوم مجھ کو بھول جا
 میرے آنسو تیرے زریں ہار کے قابل ہیں
 میرے داغِ دل تیرے گلزار سے قابل ہیں

میری الفت آہ تیرے پیار کے قابل نہیں

یعنی میں تیری محبت کے لیے ہوں تامل
بھول جا اے شاہدِ معصوم محبو بھول جا

جلوہ گاہِ زندگی تیرے لیے حیراں ہے
عظمتِ کونین تیرے نام پر فریاں ہے
اور تو اک بے نوا کی یاد میں نالاں رہے

کچھ نہیں کھلتا محبت نے تجھے کیا کر دیا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محبو بھول جا

تو نگارِ عفت و عصمت ہے آوارہ ہوں میں
تو مقیمِ جلوہ گاہِ راز اور رسوا ہوں میں
آہ کب تیری محبت کے لیے زیبا ہوں میں

کچھ تیرے عشق کی معصومیوں پر رحم کھا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محبو بھول جا

ایک ساعت کے لیے حاصل مجھے راحت نہیں
میرے سارے زندگی میں نعمتِ عشرت نہیں
آہ ہیں ناشاد ہرگز قابلِ الفت نہیں

ایک ننگِ زندگی کا غم کرے تیری بلا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محبو بھول جا

میری الفت میں نہ اپنی راحتیں ناشاد کر

میرے غم میں یوں نہ اپنی ہر خوشی برباد کر
میں تو اک خواب پریشاں ہوں نہ محکوم یاد کر

چھوڑ دے میرے لیے یہ رات بھر کا جاگنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محکوم بھول جا

فطرتِ رنگیں کو تو اے دلربا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو
اے ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو

اور تیرے دل کو ہو محبوب اک غم آشنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محکوم بھول جا

ڈر رہا ہوں تیرا رازِ عشق افشا ہونہ جائے
محرمِ اسرارِ خاموشی یہ دنیا ہونہ جائے
ضبطِ غم ہر رنگِ افسونِ تمنا ہونہ جائے

آہ! کیا ہوگا اگر یہ رازِ پنہاں کھل گیا -
بھول جا اے شاہدِ معصوم محکوم بھول جا

گر کسی سے تیرا ذکرِ عشق سن پاؤں گا میں
منہ چھپا کر بزمِ ہستی سے نکل جاؤں گا میں
آہ! پھر تجھ کو نہ دنیا میں نظر آؤں گا میں

گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے محکوم بھولا
بھول جا اے شاہدِ معصوم محکوم بھول جا

ساعر دیوی

۲۳ - مارچ ۱۹۴۱ء



عريان بود گه مين او ريشل بود گل مين تيهان لبي بو
 جهان جان بود گل ميرين جان جهان لبي بو
 بهان ميرد ورم مين بودان منجانه مين سحر
 برهن بود فضايش بخ بود بهر خزان لبي بو

از راتنه مدن در دهلوی
 ۱۹۲۱
 ۵۲۵

ساحر دہلوی

سرگزشت

امرناتھ نام، اور ساحر تخلص ہے۔ رائے بریلی میں ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ مسکن دہلی ہے۔

ان کے والد پنڈت جانی پرشاد بھان، بریلی فوج میں خزانچی اور میر منشی تھے۔ ۱۸۷۲ء میں مستعفی ہو کر دلی چلے آئے، اور ۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۲ء تک محکمہ ریلوے میں ملازم رہے۔ انھیں حسن خدمات کے صلے میں پورے مشاہرے کی پنشن اور رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔

ساحر ۱۲ سال کے سن میں پنڈت پرشاد رام رازداں کے شاگرد ہوئے، اور تین چار سال اُن سے اُردو فارسی کی تعلیم پائی۔ ذوق شعر و سخن ادائے عمر سے تھا اور حافظہ خداداد کی بدولت اُردو فارسی کے ہزار ہا اشعار یاد کر لیے تھے۔ سب سے پہلے فارسی میں اشعار کہے، اور زانوی شاگردی عبدالحکیم عاسم کی خدمت میں تہ کیا۔

قدرتِ زبان کے ساتھ فکرِ موزوں اور ذہانتِ طبع حامل تھی،

صفی، میرزا، آہر، اور آفا صوفی کے مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن حاصل کی۔

۲۲ سال کی عمر میں بلسلہ ملازمت اجیر شریف جانا پڑا۔ وہاں دوستوں کے اصرار سے ریختہ کی طرف توجہ کی۔ کچھ عرصے کے بعد دلی واپس آکر جواہر ناتھ سآقی اور رام رجپال شیدا کی صحبتوں میں شریک ہونے لگے۔ پھر عرصہ دراز تک عہدہ تحصیلداری پر ممتاز رہے، مگر شغلِ سخن جاری رکھا۔ اب بصلہ حسن خدمات اپنے وطن دلی میں پنشن پارہے ہیں۔

جنابِ ساحر، تہذیبِ قدیم کے حامل اور دلی کے وضع دار اصحاب میں سے ہیں، ان کی باتوں سے وسعتِ اخلاق، تواضع، نرمی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے؛ چنانچہ ان کا یہ شعر خود انہیں کی حالت کا مرقع ہے:

کوئی حرم سے، دیر سے منوب ہو کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تھارا کہیں ہے

سادہ وضع قطع ہے۔ چھریا جسم، متوسط قد و قامت اور کتابی چہرہ ہے۔ داڑھی، مونچھ، وغیرہ کے بال باقضاء بن سید ہو چکے ہیں۔ لیکن بایں بین و سال شعر و شاعری کی مجالس میں وہی گرا گری ہے۔ ہر ماہ کے آخری ہفتے میں معمولی مشاعرہ اور سال بسال ماہِ دسمبر کے آخر (یومِ کلان) میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرتے ہیں، جس میں قریب و بعید کے احباب باذوق اور سخن گو حضرات جمع ہوتے ہیں۔ ساحر روحانی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ”اُردو

ادب میں شاعری سے ایک قسم کا لوچ اور بیان میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں خدمتِ ادب کے لیے وہ جملہ ذرائع اختیار کرنا اولیٰ ہے، جو اس کی ترقی میں معاون و مدد ہو سکتے ہیں، اور وہ بہت ہیں۔ ہندی اور سنسکرت کے مروجہ الفاظ سے زیادہ کے شامل کرنے کے خلاف ہیں۔ صرف اُنہیں الفاظ کا استعمال جائز قرار دیتے ہیں جو اردو میں گھل جلی گئے ہیں۔

ان کے خیال میں ردیف و قافیہ کی پابندی لازمی کی جائے، اس لیے کہ جب تک ردیف و قافیہ کلام میں نہ ہو، زور نہ ہوگا۔ دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:-

انشار نہ چھڑائے نکمتِ بادِ بہاری، راہ لگا اپنی

بچھے اٹھکیلیاں سو بھی ہیں ہم نیاز بیٹھے ہیں

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصتِ کرات و

بیٹھے رہیں تصویرِ حباتاں یکے ہوئے

دریاے معاشیٰ تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھسا

نغم و غزل دونوں میں، آزاد انصاری مرحوم کو بہتر سمجھتے ہیں۔

ان کے کارنامے بصورتِ تراجم و تصانیف بہت ہیں، لیکن جس

تہ۔ مطبوعات معلوم ہو سکے، وہ حسبِ ذیل ہیں:-

تغیر عشق، فسانہ توحید، رسالہ اسرارِ حقیقت، جلوۂ جہاں نما، رموزِ

معرفت، راۓ مغفرت۔

حضرت ساحر کا ۱۹۴۲ء میں انتقال ہو گیا۔

انتخابِ کلام

حسنِ ازل صفات میں جب جلوہ گر ہوا
ترکِ وجود سے جو فنا میں گزر ہوا
کوئین ہے جو نورِ تجلی کی بارگاہ
نیرنگِ حسن و عشق میں ذاتِ صفات کے
اُس کی نظر میں ہستی عالم ہو نورِ ذات
کیوں حسن پر وہ دار کی ہیں ترانیا
آئینہ جمالِ وجودِ بشر ہوا
نورِ بختِ تجلی تارِ نظر ہوا
”کن“ سے فروغِ حسنِ ازل جلوہ گر ہوا
اک شاہِ ازل مرا تہِ نظر ہوا
نیرنگی صفات سے جو بے اثر ہوا
منصورِ رازِ عشق کا جب پردہ در ہوا

صورتِ نزول

ہے ذاتِ پاک نور علی نور بے نشان
وہ عینِ علم نورِ تجلی میں ہے عظیم
معلوم و علم و عرفاں میں نورِ ذات
جو نورِ ذات مرکزِ عینِ صفات تھا
پہناں شجر میں تخم ہوا تخم میں شجر
قائمِ ازل سے دورِ مسلسل ہوتا اب
جاں جسم ہو کے جلوہ پندار بن گئی
وہم خود می انیسینِ علمِ خبر ہوا
جو عالمِ صفات میں جب جلوہ گر ہوا
اشراق و ہوشِ سموت میں رنگِ اثر ہوا
اپنی تجلیوں میں نماں سرسبز ہوا
روشن ہے یہ مثال کہ دانہ شجر ہوا
ہنگامہ مرگ و زبیت کا وہیمِ نظر ہوا
جاں مبتدا ہوئی تو یہ جلوہ خبر ہوا

مرکز ہے نقطہ، نقطہ ہے خط، خط ہے ہر دائرہ

ساحرِ قدمِ حد و نشانِ تارِ نظر ہوا

عشق صادق

رسولِ عشق ہی ترا شیدا کہیں جسے
 مدِ نظر ہے نقشِ سویدا کہیں جسے
 اہلِ نظر میں محوِ تماشا ہے یار
 ہی منزلِ فنا میں مرا ہم سفر وہ داغ
 سینہ چمن پر غنچہ دل ہے سگفتہ گل
 ہجران نصیب دل کو ہے کیا غم کہ عشق
 دم کرتی ہی جو قالبِ فنا کی میں روحِ علم
 پردہ ہے حسن و عشق میں صلا و حجاب کا
 کوئی حرم سے دیر سے منسوب ہی کوئی

ساحرِ نفس وہ دام ہے جس میں کہ ہے ہیر
 موجِ ریم خیال کہ عنقا کہیں جسے

آہلقہ رنداں میں مست مئے لاہو جا
 دے دادِ سبک و محیِ ارجان ہوا ہو جا
 پندارِ حبا اے دل ہی پایہ خود بینی
 پیمانِ وفا تو نے کیوں روزِ ازل باندا
 تھا حسنِ خود آرائی مدِ نظر شاہد
 آنکھوں میں سنا ہوا گر سرِ محفت سناہر
 ہستی سے گزرا ہی دل اور دم فنا ہو جا
 اس گلشنِ ہستی میں ہم رنگِ صبا ہو جا
 ای لہنت بہ منزلِ ثواب روبرو تھا ہو جا
 مجبورِ قدر اے دل راضی بضا ہو جا
 نقشِ اپنا مٹا اے دل اور محو فنا ہو جا
 خاکِ درِ سینا ہے بے بیم ورجا ہو جا

کیفِ مستی میں عجیب جلوہ کینائی تھا
 حُسنِ بے واسطہ ذوقِ خود آرائی تھا
 تیری ہستی میں نہ کثرت تھی نہ وحد پیدا
 پردہ در کوئی نہ تھا اور نہ در پردہ کوئی
 لافنا تیری صفت تھی تیری ہستی کا سب
 حال تھا حالِ نہ ماضی تھا نہ مستقبل
 ذاتِ قائم تھی بذاتِ او صفت تھی معدوم
 بزم میں تو نے جو السَّائِرِخِ روشن سونقا
 فتنہ ز احسن ہوا عشق ہوا شور فگن

تو ہی تو تھا نہ تماشا نہ تماشا ئی تھا
 عشقِ بے واہمہ لذتِ رسوائی تھا
 ہمہ و بے ہمہ و باہمہ یک جانی تھا
 غیرتِ عشق نہ تھی عالمِ تنہائی تھا
 بے نشان تیرا نشان صورتِ بیتائی تھا
 از ازل تا بہ ابد جلوہ رعنائی تھا
 ”دکن“ نہ تھا معرکہِ محن آرائی تھا
 ایک عالم ترے جلوے کا تماشا ئی تھا
 رم ہوا شوقِ فرا شوقِ تماشا ئی تھا

حرف اور صورت میں آتا ہی کسی کا ہو کلام
 ساحر آغاز میں ”دکن“ غایتِ پیدائی تھا

دلِ مرشدِ زمانہ ہو دلِ نورِ ذات ہے
 دلِ جلوہ و حجابِ حیاتِ ممت ہے
 دلِ پاسبانِ ملکیتِ واردات ہے
 دلِ جلوہ گاہِ حُسن ہے عرفانِ ذات کا
 نقطہ ہے دلِ زمینِ زماں کے وجود کا
 دلِ آفتابِ عالمِ اشراق و معرفت
 دلِ نفسِ ناطقہ ہے وجود و شہود کا
 دل ہے کلیدِ قفسِ درِ گنجِ معرفت

دلِ خضرِ راہِ چشمہ آبِ حیات ہے
 دلِ رازدارِ عالمِ ذاتِ صفات ہے
 آئینہ دارِ حُسنِ رُخِ کائنات ہے
 دلِ کنِ نکال میں پیکرِ حُسنِ صفات ہے
 دلِ مرکزِ محیطِ مکان و جہات ہے
 دلِ ماہتابِ تیر و شب و اہات ہے
 دلِ مشتِ خاک میں دمِ آبِ حیات ہے
 لوحِ طلسمِ بندگی ذاتِ صفات ہے

اہل نگاہ، اہل نقیس، اہل علم کو دل ظلمتِ دو کون میں و جہ نجات ہے
 دل کے بیاں سے ہے شکر افشاں بانِ کلک
 سحرِ یہ حالِ دل ہے کہ قند و نبات ہے

قید و آزادی

عشق ہو ذوقِ فنا دل کی لگن میں رہ کر
 سر و آزاد ہیں سستی کے چمن میں رہ کر
 خوش ہے آہنگِ جرسِ با دیو تن میں رہ کر
 میں تہیں تو ہے مری جاں سکر تن میں رہ کر
 جسم سے جیسے جدا جان ہو تن میں رہ کر
 ہوش تن کا نہ رہا پس سکر تن میں رہ کر
 خارِ گلزار ہوا چشمِ چمن میں رہ کر
 چشمِ خور کا لبِ سدرِ چرخِ کہن میں رہ کر
 ذبیحہ و شِ چرخِ زناں جسکی کرن میں رہ کر
 کافرِ عشق ہوا دیر کہن میں رہ کر
 ننگِ ناموس بنوں گا ز کہن میں رہ کر
 اب ہیں آرام سے آغوشِ کہن میں رہ کر
 شوخیِ فعلِ لبِ عہدِ شکن میں رہ کر
 گنجِ منے ہے زباںِ قفلِ دہن میں رہ کر

سُن اک آن ہو بے ساختہ پن میں رہ کر
 گلِ سوا لفت کے ہنہ ہو خار سے کاوش ہم کو
 کار و اں عمر کا رہتا ہے سفر میں ہم دم
 بزمِ ہستی ہے ترا جلوہ گرِ حُسنِ جمال
 یوں رہا رنگِ تعلق سے سراپا آزاد
 ساقیِ بزمِ ازل، جامِ تھا کیا ہوشِ با
 کلِ ترانگِ اثر ہے کہ مرا حُسنِ قبول
 حُسن وہ نورِ تجلی ہے کہ بے نور ہوئی
 عشق وہ مہرِ منور ہے کہ بے کون مکان
 ابتدا عشق سے تھی عشق میں انجام ہوا
 ننگِ کونین ہوں خلد کے مرا عریانی
 وسعتِ دہر میں راحت نہ ملی جیتے جو
 دیکھتے تو خونِ تناسل ہے تبسم میں نہاں
 وا ہو سے لبِ تو کھلا رازِ طلسمِ صموت

حرف بے صوت ہو گیا ہے خموشی ساحر
سرمہ تحریر بنا چشم سخن میں رہ کر

کثرتِ جلوہ وحدت

نور سے خورشیدِ عرفاں کے جو نکلی اک شعاع	عقل و دل اول ہے اُس ضو سے اک روشن شعاع
دل سے ضو پہیلی خلا میں باد میں اور ناریں	سامعہ و لیس و ہنیش بن کے چمکی وہ شعاع
آب میں اور خاک میں ہے ذائقہ اور شامہ	میں مطیعِ ضو یہ ساتوں علم ہوا کل طماع
ایک علمی ضو لطافت اور کثافت بن گئی	علم اور معلوم اور عالم ہے اور ج ارتفاع
ہر حواس پنجگانہ کی اُسی ضو سے نمود	عقل کے پردہ کو دل میں آگئی تھی جو شعاع
خاک و آب و آتش و باد و خلا میں اک نمود	ایک ضو کو نین میں ہے جلوہ آرا بداع
ہو گیا عالم دو گانہ اک کبیر اور اک صغیر	فیض سے علم سگانہ کے ہوئی حاصل متاع

جس کا جیسا علم ہے اور جس کی جیسی ہے سرشت
اُس کو ویسا ہی نظر آتا ہے سحر الوداع

ساعتظامی

۲۲ مارچ ۱۹۸۱ء

(۲)

مخارج و بقیه مصارف
بسیار فقیرانه و کمالات

من

نظر آن نادرین و بزرگوار
پروانه و منافع و مصارف

تسلیت بقیه و خدمت
کسانی که در تربیت ایشان

بچه شرم و کینه و غریب
که بدست با کمال و کمال

مهر

۲۵/۱/۴۰

بدر

ساغر نظامی

سرگزشت

محمد یار خاں نام، ساغر شخص، تالیخ ولادت ۲۱ دسمبر ۱۹۰۷ء، مقام
دود علی گڑھ، بالاسہ قلعہ، قوم مسند یوسف زئی افغان، اور والد کا نام
احمد یار خاں ہے، جو بہروز بقید حیات ہیں۔
ان کا خاندان تقریباً ۲۰۰ سال پیشتر کابل سے ہندوستان آیا۔
مورث اعلیٰ سردار شہباز خاں نواب تھمیر کی فوج کے سپہ سالار تھے۔
ساغر کی عربی و فارسی کی تعلیم مکان پر ہوئی، اور انگریزی نویں
کلاس تک گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ میں پڑھی۔
شاعری میں استاد و شاگردی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا خیال
ہے کہ شاعری کی تکمیل شاہدہ حیات، تجربات اور مطالعہ فطرت سے
تعلق رکھتی ہے۔

فرمانے ہیں کہ ۱۵ برس کی عمر سے فوق شعر پیدا ہوا اور تیرہ
بیس کی عمر میں شعریں میں شریک ہوا۔ گویا ابتدائی تعلیم کے دوش
بدون میری شاعری پیدا ہوئی۔ غیر شعوری طور پر میں ماحول اور

روایات میں اُلجھا ہوا تھا، اس لیے میں نے شروع کا کلام مولانا یسار
اکبر آبادی کو دکھایا۔
مزاج میں ظرافت اور شوخی ہے۔ مشاعروں میں کلام ترنم سے
پڑھتے ہیں۔

اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے ان کی نظر میں تین طریقے ہیں:-
(۱) ادب کو محدود حلقوں سے نکال کر عام اور بسیط کیا جائے۔
(۲) کوئی زبان اور اُس کا ادب اُس وقت تک ترقی نہیں
کر سکتا، جب تک ادیب و شاعر کی مساعی اور کارکردگیوں
کی کوئی اقتصادی قدر و قیمت تسلیم نہ کر لی جائے۔
(۳) نشر و اشاعت کے ذرائع میں آسانی، یعنی موجودہ طریقہ
طباعت کو ترک کر کے ٹائپ کو اختیار کیا جائے۔
غزل میں میر، غالب، نومن، حسرت، جگر اور نظم میں نظیر
اکبر آبادی، انیس، اقبال اور جوش کو استاد سمجھتے ہیں۔
یہ شعر کی ترقی کے مقابل ردیف و قافیہ کو ترجیح نہیں دیتے،
البتہ بحر کا ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے۔

ان کے دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

شاد عظیم آبادی یہ بزم ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرمی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا،

میر چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھڑپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر! یہ آزار گیا

جگر لے لیا کام جو لینا تھا غم ہستی نے گرچہ ثابت نہ ہوئی میری حقیقت اُسکو

ساغراں وقت میرٹھ میں رہتے ہیں اور رسالہ ایشیا کے ایڈیٹر ہیں۔
منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں:-

- (۱) صبحی - غزلوں کا مجموعہ -
 - (۲) شبابیات - رباعیات کا مجموعہ -
 - (۳) بادۂ مشرق - نظموں، غزلوں اور رباعیات کا مجموعہ -
-

انتخابِ کلام

ہجومِ خیالات ہے اور کیا ہے وہی بارِ آفات ہے اور کیا ہے
 وہی ہم ہیں اور آرزوےِ طلاطم وہی شورِ جذبات ہے اور کیا ہے
 کہاں ہم، کہاں تم، کہاں یہ ستارے یہ دل کی کرامات ہے اور کیا ہے
 فغانِ شبی، نغمہٴ صبحِ گاہی فریبِ مناجات ہے اور کیا ہے
 جنونِ محبت، جنونِ محبت فسونِ روایات ہے اور کیا ہے
 مرے من کی دنیا، مرے من کی دنیا جہانِ طلسمات ہے اور کیا ہے
 ہے ساغر کو لٹنے کی خواہش ابھی تک

یہ سحرِ خرابات ہے اور کیا ہے

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم
 اشاروں اشاروں میں کیا کہ گئے وہ نگاہوں نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم
 ترے دل میں رہ کر، نظر میں سا کر تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم
 نہ دیکھے گئے اُس نظر کے تقاضے نہ سرتابِ پادِ عسا ہو گئے ہم
 حقیقت نہ تھی دل لگانے کے قابل حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم
 بٹا ہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت لٹے اِس قدر دہنسا ہو گئے ہم

نہیں کم یہ سہتی کی معراجِ ساغر
 کہ خاکسرایے کدا ہو گئے ہم

تو نہیں بہار کا راز داں تجھے کب وقوف بہار ہے
 جسے کہ رہا ہے شمیم تو وہ چمن کا گرد و غبار ہے
 یہ خرام اُن کا چمن چمن، شمیم اُن کا من من
 یہ سکوت اُن کا روشش روش کہ بہار محو بہار ہے
 وہ ملاحتیں وہ صباحتیں، وہ لطافتیں، وہ نزاکتیں
 وہ نظریں جب سے سائے ہیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی سزا
 وہ جدھر جیل کے گزر گئے ہیں فصائیں غرق بہاریں
 وہ جہاں جھجک کے ٹھہر گئے ہیں وہیں ہجوم بہار ہے
 تو ہے جانِ گل، تو میانِ گل، تو مکینِ گل، تو مکانِ گل
 ترے دم قدم سے ہے گلستاں، ترے دم قدم سے بہار ہے

ہم تم

وہ دور یاد ہے جب بیقرار تھے ہم تم
 بہ کارِ دل ہر تن انتظار تھے ہم تم
 وہ وقت یاد ہے جب نغمہ بارتے ہم تم
 وہ عہد یاد ہے جب کامگار تھے ہم تم
 وفا نصیب، محبت شعار تھے ہم تم

قیودِ دوری، منزل کو توڑ توڑ گئی
 جنوں کی سوئی ہوئی رُح کو چھینھوڑ گئی

دلوں نقشِ حیاتِ دوام چھوڑ گئی
جو پہلی بار ملی، اور دلوں کو جوڑ گئی
اُسی نگاہ کی اک یادگار تھے ہم تم

وہ وادیوں میں سفر اور وہ چاندنی تپاں
وہ گھاٹیوں میں شب و روز شوق کی تپاں
وہ آرزو کا مچلنا، وہ درد کی گھاتیں
یسا طُورِ دلِ پیشیت کو اُن گنت باتیں
فتوحِ عشق کے سرمایہ دار تھے ہم تم

کلی کلی سنسناں کو ناز تھا جس پر
روشِ روشِ پگستاں کو ناز تھا جس پر
چمن کہاں کا بیاباں کو ناز تھا جس پر
جہاں میں روحِ بہاراں کو ناز تھا جس پر
نسیمِ گل کی قسم وہ بہا رہے ہم تم

جو میں تھا بلبلِ گلشن، تو تم گلِ رنگیں
جو میں تھا مہر، تو تم تھیں فروغِ ماہِ بسیں
ہمارے پانوں پر چھکتی تھی ساعتوں کی حبیں
جو میں تھا صبحِ منور، تو تم شبِ زریں

جہاں عشق کے ییل و نہار تھے ہم تم
منارِ طور کا معدن تھا عالمِ ارکان

جمال و نور کا مخزن تھا عالمِ امکاں
ہمارے عکس سے گلشن تھا عالمِ امکاں
ہمارے نور سے روشن تھا عالمِ امکاں

سپہرِ عشق کے برق و شرارت تھے ہم تم

رُلا رُلا کے محبت میں دل کو روتا کون ؟

جہاںِ زلیست کو طوفان میں ڈبوتا کون ؟

اور آرزو کے کنولِ ارضِ دل میں بوتا کون ؟

جہاںِ عشق کا پروردگار ہوتا کون ؟

جہاںِ عشق کے پروردگار تھے ہم تم

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی عاشقیِ بیعت

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی ساحریِ بیعت

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی زندگیِ بیعت

ہمارے ہاتھ پہ کرتی تھی شاعریِ بیعت

جہاںِ شعر کا وہ شاہکار تھے ہم تم

شرارِ گل نے چمن کو کیسا تھا خاکستر

صبا نے خاکِ اُلٹ دی تھی جامِ ساغر پر

حد سے شمع تھی محفل میں آتشِ کیر

مواں کا ذکر نہیں دل تو خاک تھے جل کر

کتنی جگہ تو نگاہوں پہ خار تھے ہم تم

وہ حسن، عشق کی حکمت نے ہم کو بخشا تھا
 وہ شوق، حسن کی فطرت نے ہم کو بخشا تھا
 وہ ذوق، ساقی قدرت نے ہم کو بخشا تھا
 وہ ظرف، کیفِ محبت نے ہم کو بخشا تھا
 کہ آنکھ بند تھی اور ہوشیار تھے ہم تم

سمن بہن تھا بلاوا، سحر سحر آغوش
 چمن چمن تھی تنہا، شجر شجر آغوش
 نفس نفس تھا تقاضا، نظر نظر آغوش
 نہ تھا نشانِ زمان و مکاں، مگر آغوش
 قدم قدم پہ کبھی ہم کنار تھے ہم تم

ہمارے دم سے ندا تھی ہمارے دم کریم
 ہمارے دم سے صدا تھی ہمارے دم سے کلیم
 ہمارے دم سے گھٹا تھی ہمارے دم سے نسیم
 ہمارے دم سے سحر تھی ہمارے دم سے نسیم
 کہ حاصلِ چین روزگار تھے ہم تم

ہر ایک ذرے سے کرتے تھے آسماں پیدا
 ہر ایک نقطے سے کرتے تھے سو جہاں پیدا
 ہر ایک چپ سے ہماری تھے سویاں پیدا
 ہر اک نگاہ سے کرتے تھے دستاں پیدا

قدم قدم پہ فسانہ نگار تھے ہم تم

وفا کے نقش پہ قرباں تھی لالہ کاری بھی

و فوہ کیف سے رقصاں تھی کاسکاری بھی

مٹی ہوئی تھی تعلق سے دوست داری بھی

اثر سے وجد میں تھی روت جاں نشاری بھی

کچھ ایک دوسرے پہ یوں جاں نثار تھے ہم تم

تصورات پہ ہلکا سکون چھایا تھا

تغیرات پہ گہرا سکون چھایا تھا

یہ کائنات تھی سادہ سکون چھایا تھا

ہر ایک شے پہ کچھ ایسا سکون چھایا تھا

کہ جیسے سارے جہاں کا قرار تھے ہم تم

قیامتیں تھیں بپا چرخ کی سیاست میں

ہمارے نام تھے سرنامہ بناوت میں

کھٹک رہے تھے بہت دن سو خیم فطرت میں

ہماری ذات تھی اک تیر قلب قدرت میں

ازل سے خیم شیت میں خار تھے ہم تم

ہر ایک پردہ تھا مضرب ساز الفت کا

کمال دیکھیے اک نعمت محبت کا

ظالم ٹوٹ گیا تھا حریم قدرت کا

گلا سا بیٹھ گیا تھا نفیرِ فطرت کا

چمن میں جھوم کے یوں نغمہ بارتے تھے ہم

وہ بھیید ہے کہ کوئی اُس کو پا نہیں سکتا

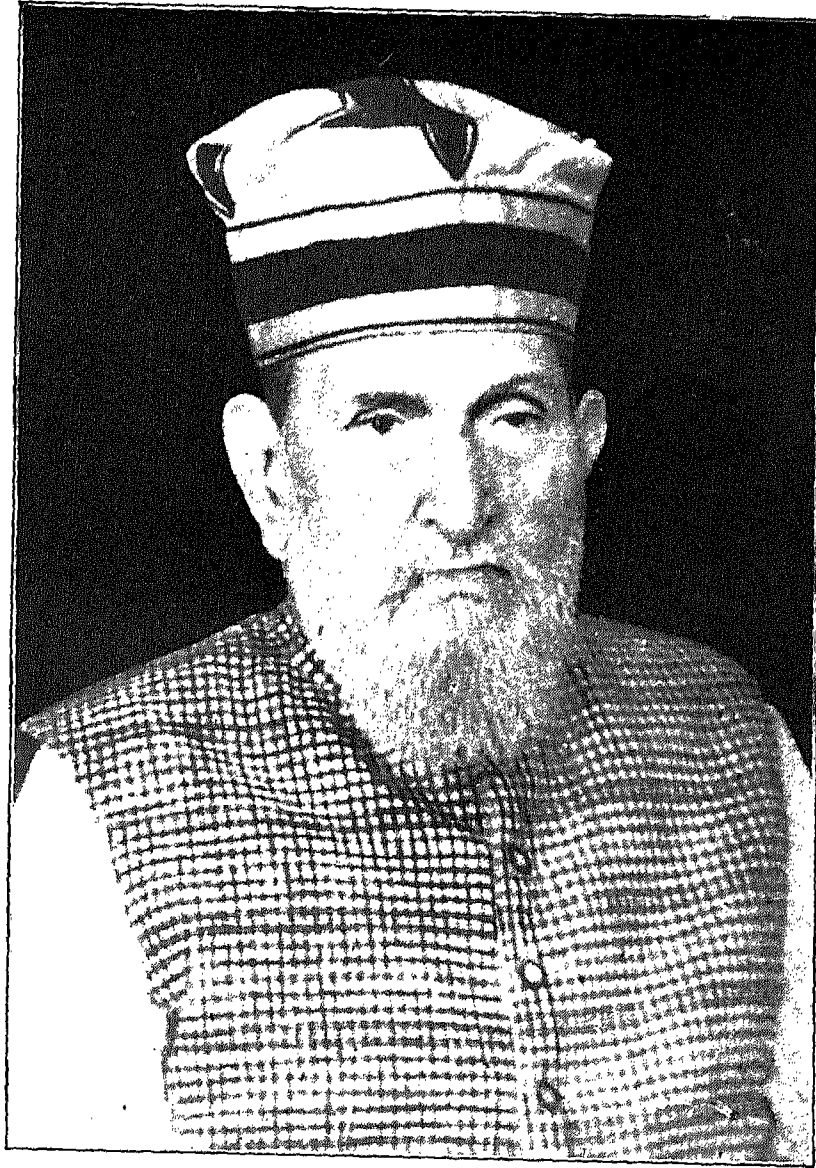
وہ نغمہ ہے کہ کوئی اُس کو گانہ نہیں سکتا

میں دیکھ سکتا ہوں پردہ اٹھا نہیں سکتا

میں سوچتا ہوں مگر لب پہ لا نہیں سکتا

کہ کس جنونِ وفا کا شکار تھے ہم تم

سائل دیہوی



سائل دهلوی

سائل دہلوی

سرگزشت

سراج الدین احمد خاں تام، سائل تخلص، سنہٴ ولادت ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء، مقام ولادت دہلی، اور والد کا نام نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابن ضیاء الدین احمد خاں جاگیر دار ریاست لوہارو ہے۔ چار سال کی عمر میں سایہ پدری سہرے اُٹھ گیا، اور اپنے جدِ بزرگوار کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانے لگے۔

عربی و فارسی کی تعلیم میلوٰی قاسم علی سنہ اور فنی کتابیں میرزا ارشد علی گورگانی سے پڑھیں اور انھیں کو ابتدائی کلام دکھایا۔ گورارنگ، چوڑے چکے اعضاء، اور خوبصورت ناک نقشہ ہے، وسیع انخیالی، متخل مزاجی، عالی ہمتی، اور فراخ حوصلگی کا مجسمہ اور دلی میں شاہی عہد کا لباس استعمال کرنے والوں کی مبارک یادگار ہیں۔ پہلی شادی نواب ممتاز حسن خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ چند سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، تو دوسرا عقد ۳۴ سال کی عمر میں فیض الملک نواب میرزا خاں داغ دہلوی کی دختر خواندہ سے ہوا۔

اس نسبت سے ذوقِ شاعری نے بھی رنگ بدلا، اور معاملہ ہندی و
وارداتِ قلبی ان کا میدان قرار پایا۔ انہوں نے تین سال کی مشق
میں جنابِ داغ کے تلامذہ ارشد میں جگہ پائی۔

شوقِ شعر گوئی کے علاوہ شہسواری اور پولو کا از حد شوق تھا
اور بہترین ”جاکی“ شمار ہوتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد دکن
میں لنگی میں پاؤں اُلجھا اور گر پڑے، جس سے کولہا اُتر گیا۔ اس کی
تکلیف ہنوز باقی ہے، حتیٰ کہ بغیر سہارے کے اٹھنے بیٹھنے سے بھی
معذور و مجبور ہیں۔

اب سلسلہ شعر و شاعری منقطع ہو گیا ہے، حافظِ نسیان سے
بدل رہا ہے، نورِ بصر رو بہ انحطاط ہے اور اعضا میں بھی ضعف پیدا
ہو گیا ہے۔ شبانہ روز میں جو وقت کرب و بچہتی سے بچتا ہے، وہ یاد
خدا و فکرِ آخرت میں گزرتا ہے۔

ان کے نزدیک ”شاعری میں سب سے اہم پہلو زبان کا ہے
اور ساتھ ہی اس کے علوم و فنون کی تربانی“

یہ ہندی اور سنسکرت کے اُن الفاظ کے حامی ہیں، جن سے
زبان میں ثقل و گرانی پیدا نہ ہو۔ اشعار میں ردیف و تافیہ کی پابندی
اُسی طرح ضروری سمجھتے ہیں جس طرح گانے کے لیے مزامیر۔
دیگر اساتذہ کے جذبِ پسندیدہ اشعار حسبِ ذیل ہیں:-

مسجد ایسی بھری بھری کب تھی نہ میکہ نہ اک جان بگویا

ہاتھ بکھلے اپنے دونوں کام کے

دل کو تھا ما اُن کا دامنِ تمام کے

میر
داغ

دآغ کے سب حرف لکھتے ہیں جدا
 ٹکڑے کر ڈالے ہمارے نام کے
 یہ پھرتی ہے بیل چوہ میں گل
 شہید ناز کی تربت کدھر ہے

نواب معاصر درو

غزل میں آرزو کھنوی، سیاب اکبر آبادی، دآغ، غالب، اور
 تیر درد کو، اور نظم میں نظیر اکبر آبادی کو مستند مانتے ہیں۔
 سائل نے مضامین کی شگفتگی، الفاظ کی بندش، ترکیب کی
 جستی، محاورات کی دل کشی فصیح الملک سے ورثے میں پائی ہے،
 اور حضرت دآغ کے ممتاز شاگرد جن خصوصیات کے حامل ہیں، ان
 میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں

ان کا طرز غزل خوانی نہایت دل کش اور پُر درد ہے۔ دن رات
 گھر پڑے پڑے دل گھبرا جاتا ہے، اس لیے سہ پہر کو رکشا میں لیٹ
 کر اکثر جامع مسجد کے قریب رحیمہ کتب خانے آ جاتے ہیں، اور جب
 تک دل چاہتا ہے، رکشا میں لیٹے لیٹے سیر کرتے رہتے ہیں۔ اہل
 ذوق اور قدردانوں کا اکثر جمع ہو جاتا ہے۔

خرابی صحت کے باعث باوجود توقع بزم سخن رامپور کی کسی
 مجلس میں تشریف نہ لاسکے۔

انتخابِ کلام

ہیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخیمِ جگر والے
نظر آئیں گے نقشِ پلجھاں اُس فتنہ گروالے
ستمِ ایجاد یوں کی شان میں بیانا آجائے
جفا و جورِ گلیں سے چمنِ ماتم کدہ ساہی
الف سے تا ہ یا اللہ افسانہ سنا دیجے
ہیں معلوم ہی ہم مانتے ہیں ہم نے دیکھا کہ
کٹانے کو گلا آٹھوں پر موجود رہتے ہیں
ذرا تم بھی تو دیکھو ہم کو تم بھی ہوتا نظر والے
چلیں گے سر کے بل سیتہ وہاں کدہ گزروالے
نہ کرنا بھول کر تم جو جریخ کینہ و رولے
پھڑکتے ہیں قفسِ کی طرح آزادی میں پالے
جناپِ موسیٰ عمراں وہی حیرت نگر والے
دل آزدہ ہوا کرتے ہیں از حدِ چشمہ تر والے
وہ دل والے جگر والے سہی تم بھی ہیں مثلاً

تماشا دیکھ کر دنیا کا سائل کو بوائی حیرت

کہ تکتے رہ گئے بدگوہروں کا منہ گہروالے

زعمِ نیکو شمعِ روزم کے سوز و ساز پر
زیب نہیں ہے شبنم کے کش پاکباز پر
کہتا ہوں جس میں سے میں نیتِ عشق ہو مری
فرقِ حیاتِ مرگ کا مرغِ چمن کے دل کی چوہ
خوابِ لحد کی پر سکوں عہدِ حیاتِ پرالم
سنگِ درِ حبیب پر ہوتا ہوں سجدہ ریزیں
منعم بے بصری نہیں دیکھیے تاکجا رہے
فخرِ عمل نہ چاہیے سعیِ عمل ضرور ہے
رکھو نظر بجائے نازِ خاطرِ سپرنا ز پر
نقشیں سو لگی گئی گارِ داغِ مہیں نیاز پر
آئے گا میرا دل گر شاہِ دل نواز پر
دیتا ہوں فوقِ دام کو جھلکِ شہباز پر
موتِ نیکوں ہو طعنہ زانِ زندگی دراز پر
خلقِ خدا ہے معتزل مجھ پہ مری تما ز پر
محوِ نشاط و خوشہ کی نغمہ تار ساز پر
آنکھ رہے لگی ہوئی رحمت کا رساز پر

در پہ بتوں کے دی صدا سائل بے نوائے یہ
 فضلِ خدا رہے مدامِ حالِ گدا نواز پر
 امانتِ مقرب کے گھر شرابِ ارغواں رکھ دی
 تو یہ سمجھو کہ بنیادِ حشراتِ منساں رکھ دی
 کہوں کیا پیشِ زنا بہ کیوں شرابِ ارغواں رکھ دی
 مری توفیق ہو کچھ تھی برائے یہاں رکھ دی
 یہاں تک تو نبھایا میں نے ترکِ مے پرستی کو
 کہ پینے کو اٹھالی اور لیں انگڑائیاں رکھ دی
 جنابِ شیخ نے خانہ میں بیٹھے تیا برہنہ سر
 اب اُن سے کون پوچھے اپنے گڑھی کہاں رکھ دی
 تنہیں پر واند ہو مجھ کو تو نفسِ دل کی پرواہ ہے
 کہاں ڈھونڈوں کہاں پھنکی کہاں بکھیروں کہاں رکھ دی
 نکالیں گے اُسے اہلِ و ذابہ شہرِ آنکھوں سے
 اگر پائے بد پر اُس نے خاکِ آستان رکھ دی
 ادمہ پر نوح کر ڈالا قفس میں اُن سے بیدری
 ادمہ اک جلتی چنگاری میانِ آشیاں رکھ دی
 عمیر اُس کا ڈبو دے گا اُسے آپہ خجالت میں
 دغا داری کی تہمتِ غیر پر کیوں بدگماں رکھ دی

ہوس مستی کی سائل کو نہیں کافی ہے تھوڑی سی ۔

پیالے میں اگر پس خوردہ پیر مغساں رکھ دی

حق و ناحق جلا تا ہو کسی کو تو جلا دینا
ترو و برق ریزوں میں تمہیں گرنے کی کیا جتن
دلوں پر بجلیاں گرنے کی صورت گر کوئی چوہ
ہوئی بجلی سے کس دن نقل اندازِ ستم کا
سنگاری کی تعلیمیں انھیں دی ہیں یہ کہہ کر
تکلف بر طرف کیوں پھول لیکر اور تبت
نہ کیوں ہم انقلاب ہر کو مانیں اگر نکھیں
نہ جانا توانی پر کہ اب بھی سعی ناخن سے
کوئی روئے تمھارے سامنے تم مسکرا دینا
تمہیں کافی ہے ہنستا دیکھ لینا مسکرا دینا
تو میں کہ دوں تمھارا دیکھ لینا مسکرا دینا
تمھاری طرح سیکھا لاکھ اس نے مسکرا دینا
کہ روتا جس کسی کو دیکھ لینا مسکرا دینا
مگر جب فائدہ کو ہاتھ اٹھانا مسکرا دینا
گلوں کا نالہ کرنا بلبلوں کا مسکرا دینا
دکھا سکتے ہیں ہم زخم کس کا مسکرا دینا

تمھارے نام میں کیا زعفران کی شاخ ہر سائل

کہ جو سنتا ہے اس کو اُس کو سن کر مسکرا دینا

بسا اوقات آجاتے ہیں دامن سے گریباں میں

بہت دیکھے ہیں ایسے جوشِ اشکِ چشم گریباں میں

نہیں ہے تابِ غمِ غم کسی عاشق کے مکان میں

دلِ خوگشتہ یا دامن میں ہو گا یا گریباں میں

مبارک، بادِ گردو، بہار آئی سیاہاں میں

نودِ زنگِ گل ہے ہر سرِ خارِ مغبلاں میں

زیادہ خوفِ سوانہی نہیں ہے سو نہ پنہاں میں
 دھواں ہوتا ہے لیکن کم چراغِ زیرِ داماں میں
 ہمیشہ پی کے سے جامِ و صراحی توڑ دیتا ہوں
 نہ میرا دل ترستا ہے نہ فرق آتا ہوا یاں میں
 مذہب کیوں کاوشِ زخمِ جگر کا آج کم کم ہے
 نمک کی کوئی پٹکی رہ گئی ہوگی نسکداں میں
 جنابِ تیس نے دل سے بھلایا دونوں عالم کو
 جنوں کے چار حرفوں کا سبق لیکر دبستاں میں
 بہار آئی ملا یہ حکم مجھ کو اور بلبل کو
 کروہ کاٹے ٹفٹ میں خاک چھانوں میں سیاں میں
 ترنمِ ریزیاں بزمِ سخن میں سن کے سائل کی
 گماں بوتا ہے بلبل کے چمکنے کا گلستاں میں

اڑا سکتا نہیں کوئی مرے اندازِ شیون کو
 بشکلِ کچھ سکھایا ہے نواسنجانِ گلشن کو
 گریباںِ چاک کرنے کا سبب وحشی نے فرمایا
 کہ اس کے تارے کر میں سیوں کا چاکِ امن کو
 بہار آتے ہی ہٹتی ہیں یہ چیزیں قید خانوں میں
 سلاسلِ ہاتھ کو ہاتھوں کو بٹری طوقِ گردن کو

جھڑی ایسی لگا دی ہر مرے شکوں کی پازش نے
 دبار رکھا ہے بھادوں کو بھلا رکھا ہے ساون کو
 دل مرحوم کی میت اجازت دو تو رکھ دیں ہم
 ترے تلوے برابر ہی زمیں کافی ہے دفن کو
 اجازت دو تو ساری انجمن کے دل ہلا دوں میں
 سمجھ رکھا ہے تم نے سچ تاثیراتِ شیون کو
 سلوکِ پیرے خانہ کی اے ساقی تلافی کیا
 بجز اس کے دعائیں دو اُسے پھیلا کئے ہر کون

خزاں کا جو گلشن سے پڑ جائے پالا
 تو صحنِ جن میں نہ گل ہو نہ لالا
 لیا تیرے عاشق نے برسوں سنبھالا
 بہت کر گیا مرنے والا کسالا
 پئے فاتحہ ہاتھ اٹھا دے گا کوئی
 مہر تربت بے کساں آنے والا
 اسی گریہ کے تار سے میری آنکھیں
 بنا دیں گی ندی بسا دیں گی نالا
 بٹھا کر تمہیں شمع کے پاس دیکھا
 تم آنکھوں کی پستلی وہ گھر کا اچالا
 خطِ شوق کو پڑھ کے فاصد سے بولے
 یہ ہے کون دیوانہ خط لکھنے والا

ق

دیا حکم ساقی کو پیر مغاں نے
 پئے محتسب جام و مینا اٹھالا
 یہ سنتے ہی میخوار بولے خوشی سے
 ہمیں سا ہے یہ نیک اللہ والا

حقیقت میں سائل نے ذوقِ اوستا

جہاں تک اچھالا گیا نام اچھالا

ہوتے ہی جواں ہو گئے پابندِ حجاب اور
گھونگٹ کا اضافہ ہوا بالائے نقاب اور
جب میں نے کہا کم کرو آئینِ حجاب اور
فرمایا بڑھادوں گا ابھی ایک نقاب اور
پینے کی شراب اور جوانی کی شراب اور
ہشیار کے خواب اور میں مدہوش کے خواب اور
گردن بھی ٹھکی رہتی ہے کرتے بھی نہیں بات
دستورِ حجاب اور میں اندازِ حجاب اور
پانی میں شکر گھول کے پیتا تو ہے اے شیخ
خاطر سے ملا دے مری دو گھونٹ شراب اور
ساقی کے قدم لے کے کہے جاتا ہے یہ شیخ
تھوڑی سی شراب اور دے تھوڑی سی شراب اور
سائل نے سوال اس سے کیا جب بھی یہ دیکھا
مٹا نہیں گالی کے سوا کوئی جواب اور

جتاتے رہتے ہیں یہ حادثے زمانے کے
کہ تنکے جمع کریں پھر نہ اشیانے کے
سبب یہ ہوتے ہیں ہر صبح باغ جانے کے
سبق پڑھاتے ہیں کلیوں کو مسکرانے کے

ہزاروں عشق جنوں خیز کے بنے قہقہے

درق ہوئے جو پریشاں مرے فسانیکے

ہیں اعتبار سے کتنے گرے ہوئے دکھیا

اسی زمانے میں قہقہے اسی زمانے کے

قرارِ جلیوہ نمائی ہو اسے سرِ دا پر

یہ طول دیکھیے اک مختصر زمانے کے

نہ پھول مرغِ چمن اپنی خوشنوائی پر

جواب ہیں مرے نالے ترے ترانے کے

اُسی کی خاک ہے ماتھے کی زریب بندہ نواز

جبینِ نقشِ پڑے ہیں جس آستانے کے

سیماب اکبر آبادی

۲۳ - مارچ ۱۹۴۱ء

عزیز میرا خانہ



۱۲۴
 این را به خودی خود
 نمی دانم که چه باشد
 و چه می شود که این
 همه را به خودی خود
 نمی دانم که چه باشد

بر این جهان که از دستم
 می افتد و می رود

من نمی دانم که چه باشد
 و چه می شود که این
 همه را به خودی خود
 نمی دانم که چه باشد
 و چه می شود که این
 همه را به خودی خود
 نمی دانم که چه باشد
 و چه می شود که این
 همه را به خودی خود
 نمی دانم که چه باشد

در این جهان که از دستم
 می افتد و می رود

سیاب اکبر آبادی

سرگزشت

ماشق حسین نام، اور سیاب تخلص ہے۔ جامی الآخزہ ۱۲۹۹ھ ہجری مطابق سنہ ۱۸۸۱ء میں سیچر کے دن بیچ کے وقت اکبر آباد (آگرہ) کے محلہ نانائی منڈی بکوگلی اعلیٰ والے مکان میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد مولوی محمد حسین، اجیر شریف میں ٹائٹس آف انڈیا پریس کی شاخ کے اعلیٰ افسر تھے۔ یہ دنیا کے دلدادہ، اور مذہب کے بڑے پابند تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ وعظ اور شعر گوئی کا بھی ذوق تھا۔ اپریل ۱۸۸۵ء میں بمقام آگرہ انتقال کیا۔

جناب سیاب فارسی و عربی کی کتب متداولہ کی تکمیل کے بعد انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ ۱۷ سال کی عمر تھی۔ اور ایف، اے کا آئینہ امتحان دینے والے تھے کہ والد کے انتقال کے باعث سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور کالج چھوڑنا پڑا۔ میں سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔

اس وقت ایک لڑکی اور چار لڑکے بقید حیات ہیں۔
ذوق شاعری فطری اور میراث پدری ہے۔ ان کا دستور تھا کہ فارسی نصاب میں جس قدر اشعار پڑھتے، ان کا اردو ترجمہ نظم کر کے اپنے

اساتذہ کے سامنے رکھ دیا کرتے۔ کالج کی زندگی میں مولوی سدید الدین قریشی اور مولوی تحسین علی اجیری وغیرہ نے ذوقِ شاعری کو اور ابھار دیا اور یہ امتحان کے پرچوں میں بھی فارسی نظم کا اُردو نظم میں ترجمہ کرنے لگے۔

حضرت سیاب سفید رنگ، موزوں اندام، کشادہ پیشانی، سادہ مزاج، سنجیدہ خیال، بلند اخلاق، پُر خلوص اور محبت پیشہ ادیب و شاعر ہیں۔

عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ انگریزی دفاتر کی ملازمت میں گزرا۔
کہتے ہیں۔

فطرثا عجز طبیعت بن گیا رنگِ چٹا

عمر بھر سیاب پابندِ اطاعت ہی رہا

جس زمانے میں بسلسلہ ملازمت کانپور میں مقیم تھے، لکھنؤ میں جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن ان کی طبیعت فطرثا دہستان دہلی کی طرف مائل تھی۔ ۱۹۴۷ء میں نصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور اصلاح کا سلسلہ نصیح الملک کی وفات سے کچھ پہلے تک برابر جاری رہا۔

کانپور کے دوران ملازمت میں نظرِ وارثی اور یہ ایک مکان میں رہا کرتے تھے، ان کی تشویق سے انھیں کے ہمراہ دیود شریف جاکر حضرت شاہ وارث علی صاحب سے بیعت کی۔

تالیف و تصنیف کا عہد طفلی سے شوق تھا۔ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک ۲۸۴ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہنمائی میں

ان میں سے چند منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں:-
 کآرِ امروز، کلیمِ عجم، نیستار، پیامِ فردا، توراتِ مشرق، کیمیات
 ادب، سرودِ غم، پیغامات۔

بقولِ مولف خیمائے جاوید فنِ تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے،
 تغزل میں متانت کو مد نظر رکھتے ہیں اور طرزِ حالی و رنگِ اقبال کے
 درمیان ایک شاہراہ نکالنے میں کوشاں ہیں۔

جنابِ سیاب نے اپنے شاعرانہ معتقدات کے تحت حسب ذیل
 خیالات کا ”کلیمِ عجم“ میں اظہار کیا ہے۔

”سلسلہ سے میرا رنگِ تغزل بالکل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں
 بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامل ہوں، میں شاعری
 میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری
 کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اُس کے متعلقات ہوں،
 یا جو امد و پستی کی انہیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حُسن
 محض اور عشقِ محض ہے، اور ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاملِ حُسن
 ہو اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علمِ شاعری کے لیے لازمی اور ضروری
 ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو لازم و ملزوم سمجھتا ہوں، اور خیالات
 میں تضاع یا بناوٹ کا حامی نہیں۔“

میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں
 اور حقیقی وارداتِ قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام
 اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے، مگر میں نظم و غزل اور رباعی
 کو اظہارِ خیالی کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا

ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیالات کے ساتھ بلند الفاظ کا موبد ہوں،
ایسے الفاظ جن میں غراست نہ ہو اور جنہیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی
سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل
سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لیے کہ غزل جس چیز کا
نام ہے وہ اپنی قدامت اور کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کار آمد نہیں۔
شعرا سے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال باہمال اور ختم کر چکے ہیں۔
سنہی شعرا کے لیے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی
ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنف سخن اردو شاعری
کو کار آمد اور مفید بنا سکتی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ توجہ اسی
کی طرف ہونی چاہیے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی شعر ہے اور
شعر زندگی ہے۔ کائنات بغير "شاعر" کے ایک سارے بے نغہ ہے۔ شاعر
دنیا کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغير دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام
و وحی کا وہ سلسلہ جو پیغمبروں کے مبعوث نہ ہونے سے ختم ہو چکا ہے،
"شاعر" کے دماغ اور سروس میں اب بھی باقی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا۔
حضرت سیاب عرصہ ہوا ملازمت سے استعفا دے چکے ہیں اور سلسلہ
سے اکبر آباد میں رہتے ہیں اور اردو ادب کی خدمت کرتے ہیں۔
شاگردوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ خود ان کے بقول "شاید کسی کو مل
ہو۔"

انتخابِ کلام

تاج شاہی

محبت کی ٹھوکروں میں

۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کا ایک نمونہ

جسے دیوانگی کہتے ہیں الفت کی نبوت ہو

غنیمت ہو جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جا

مرحبا اے وارث اور نگِ مغربِ مرجا	تو نے روحِ ماضیِ مشرق کو زندہ کر دیا
صرف دیجوتی اداے کجکلاہی تو نے کی	تو نے کی ہاں فی الحقیقت بادشاہی تلو کی
تاج شاہی ہر اک انگڑائی ترے ایشاکا	قیصری ٹھوکر ہے تیرے جذبہ خودار کی
جو گالفت کا لیا تو نے بقیدِ سروری	بل گئی فیضِ محبت سے تجھے پیغمبری
تو نے ثابت کر دیا دنیا کی عظمت کچھ نہیں	دل کی دولت دلی دولت کے حکومت نہیں
ریشک ہو جس پر سلاطین کو وہ قہر نری	دل کی لامحدود دنیا پر حکومت ہے تری
صرف تقویمِ سیاست میں سلاطین کا ہر نام	اور تاریخِ ادب میں مل گیا تجھ کو مقام
تیری منزل منزلِ دارا و جم سے دور ہے	تو دیا رِ عشق کا اک صاحبِ دستور ہے
تو کہ اس مردود و مطلقہ کو ہر چھوڑ کر ہے	متفعلِ دنیا کھڑی ہو تجھ سے منہ موڑ کر ہے
دیکھ اے شہزادہ درویشاؤ دل شناس	سب بشارت دے رہے ہیں تجھ کو مستقبل شناس

کس بلندی پر مذاقِ حُسن لایا ہے تجھے عشقِ خود دینے مبارک باؤ آیا ہے تجھے
 نفیس دلِ بردرتِ نوبتِ زنِ فریاد باد
 سینہات از شورِ رشِ غم، شاد باد، آباد باد

ای محبتِ تجھ کو سجدے تیری قوت کو سلام جس کی قسمت تو بنائے اُسکی قسمت کو سلام
 ہے خدائی سے الگ تیرا نظامِ اُوی تیری نظرسِ حکمرانی، تیری ٹھوکرِ فیضی
 شادمانی تیری رفعت کی ہو ادلفرُ غم ترے آتشکدے کا شعلہ کونین سوز
 تیری دنیا ہے بلند اس عالمِ ناپاک سے طورِ بننے ہیں ترے انفاسِ آتشاک سے
 جس نسلِ رنگ سے ہو تیری فطرتِ نیاز کر مکنا چیزِ کامل، اور موسیٰ کا گداز
 تیرے آگے کیا بلا ہے احتیاطِ سلطنت اک اشارے سے اُلتی ہے بساطِ سلطنت
 زلزلے آتے ہیں محلوں میں تری آواز نے غم کیسے! دل بندھے پھرتے ہیں تیرے سار
 تیرے ٹھوٹے ہو ہاتھوں میں اتنا اختیار اک بھکارنِ مولے سکتی ہو تاجِ شہر یار
 فرش سے تاعرشِ سب پر دٹھا دیتی ہو تو بخود ہی دیکر خدا سے بھی ملا سکتی ہے تو
 پردہ دارِ ماوراءِ الماورا تو ہی نہ ہو حسینِ ظن کو ہے یہ اندیشہ خدا تو ہی نہ ہو

گر خدائے دیگر است این قوت و سبجانِ کسیت
 انقلابِ عالمِ ایجاد، ہر رومانِ کسیت

نجاتِ دائمی جو حُسنِ دلوں کی نگاہوں میں جسے آنا ہو آجائے محبت کی پناہوں میں
 دو عالم کو یہ پھرتے ہیں اپنی نگاہوں میں وہ جلوے کیا سا سکتے ہیں انسان کی نگاہوں میں
 نظر والا نہیں مجھ سے اٹھاری جلوہ گاہوں میں میں حیرتِ بتوں کی پیش کرتا ہوں گاہوں میں

جھلک اُس اِز سربستہ کی ہر سیر گناہوں میں
 نہ ہوتا احترامِ عشق اگر اُن کی نگاہوں میں
 عریضِ عشق، محرابِ حرم، طاقِ صنم خانہ
 وہی اک اہ لی مردِ وفا کی سمیت کوشی نے
 عجب کیا خاتمہ ہا بخیر ہود و عِسلامی کا
 تصوُّ کی نگاہوں میں جہنم لے سقتیں تھیں
 وفا کی طرح اک دن حُسن بھی اسکو مٹا دیتا
 گناہوں پر ہر ہی انسان کو مجبور کرتی ہے
 تمھاری موت بھی اک زندگی ہوا و عدم والو
 نہ جانے کون ہر گمراہ، کون آگاہِ منزل ہے
 گناہوں کی یہاں تعمیر ہوتی ہر نگاہوں سے
 غرور ان میں سچِ سخوت ان میں کبرِ خودی ان میں
 گھٹو گے دل میں کب تک پھیل جاوے دستانِ نیکر
 رو منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
 ہے اک معصومِ نعمت کوہ و صحرا کی یہ رنگی
 وہی طور اور وہی دیرِ حرم صرف اک تغیر ہے

چھپا رکھا تھا جسکو صوفیوں نے خانقاہوں میں
 تو کیوں یہ ہتمامِ حُسن ہوتا کجکلاہوں میں
 اگر تم ہونگا ہوں میں تو سبکچہ ہونگا ہوں میں
 جو بے نقشب قدم تھی منزلِ مستی کی راہوں میں
 کہ اب ذہنِ فطرت کے وطن کے خیر خواہوں میں
 ہم اکثر سیر کر آئے تمھاری سیر گاہوں میں
 جیاتِ عشق اگر ہوتی نہ فطرت کی ناپاہوں میں
 جو اک بے نام اور فانی سی لذت گناہوں میں
 سکوں انگڑائی لیتا ہے تمھاری سیر گاہوں میں
 ہزاروں کلاواں میں زندگی کی تپاہوں میں
 نگاہوں میں جس حرف آئے وہی آئے گناہوں میں
 یہ جتنے سر جھکے رہتے ہیں سہمی سجد گاہوں میں
 کسی دن تالبلک جاوے چھپ کر میری گاہوں میں
 امیر کاواں بھی ہیں انھیں گم کردہ راہوں میں
 نہ آئے حسن کے گم ہمارے جلوہ گاہوں میں
 کہ اب پتھر میں اور بجلی نہیں ہے جلوہ گاہوں میں

ہم اے سیما و نیلے ادب کے ہیں وہ عرفانی
 ہمارا ذکر ہوتا ہے ادب سے بادشاہوں میں

میں تنہا آب و رنگ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا
 یہ دل والہ! اگر تو اس میں مہماں ہو نہیں سکتا
 نہ گھبرا بھیجے اگر اُس کا نمایاں ہو نہیں سکتا
 ارے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا
 یہاں ہر چیز میں بھر دی گئی ہیں تو تیں کل کی
 وہ ذرہ ہی نہیں ہے جو بیا بیاں ہو نہیں سکتا
 معاذ اللہ کمالِ عظم ہستی کی یہ عایت ہو
 کہ انسان واقفِ انجائِمِ انساں ہو نہیں سکتا
 مجھے حیراں نہ کر ہاں میری صورتِ عیاں ہو جا
 میں آئینہ تو بن سکتا ہوں حیراں ہو نہیں سکتا
 نہیں اک لفظ ایسا دفترِ کونین میں کوئی
 جو میری داستانِ دل کا عنوان ہو نہیں سکتا
 لٹکے دل کو بھی جب دل کے پچھلے الٹ جائیں
 سے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا
 شکستہ عالمِ گل ہے تو ہوگی بارشِ گل بھی
 وہ ہو یا یوس جو خاکِ گلستاں ہو نہیں سکتا
 وہاں لائی ہو حرصِ آدمیتِ نفعِ کرنے
 جہاں صدیوں میں پیدا ایک انسان ہو نہیں سکتا

امیدیں کچھ محبت کی ہیں کچھ ہیں حُسن کے وعدے
ابھی شیرازہٴ عالم پریشاں ہو نہیں سکتا

محبت کی بلند انجامیوں کا کیا ٹھکانا ہے

فرشتہ بھی شریکِ درواںساں ہو نہیں سکتا

نودِ گل سے خاکِ گل تک اک دُنیا بدلتی ہے

شمارِ انقلاباتِ گلستاں ہو نہیں سکتا

مذاقِ ضبط و قیدِ جبر سے مجبور ہوں اتنا

کہ باوصفِ پریشانی پریشاں ہو نہیں سکتا

سُناے چپکے چپکے دل کے پردے کھینچنے والے

تری جدِ خودی تک دو نمایاں ہو نہیں سکتا

خدا اور ناخدا ایل کر ڈبودیں یہ تو ممکن ہے

مری و جبرِ تباہی صرف طوفاں ہو نہیں سکتا

دُعا جائز، خدا برحق، مگر مانگوں تو کیا مانگوں

سمجھتا ہوں کہ میں دُنیا بداماں ہو نہیں سکتا

جوانی بھی گئی سیلابِ فصلِ گلِ فشاںی بھی

میں اب تا دیر محفلِ میں غزلِ خواں ہو نہیں سکتا

معراج

اور ایک لمحہ فکریہ

کبھی انسان کی پرواز تھی بامِ ثریا تک
کبھی تھیں غارِ لولاکِ فحشیاں اسکی
کبھی اسکی نظریں سچتیں کوئی مکانِ شکی
فرشتوں میں کبھی تھا منعقد دربارِ عالم کا
ثریا کیا، رسائی اسکی تھی عرشِ معلیٰ تک
سبھی تھے انجم و افلاک گردِ کارِ رواں اسکی
کبھی اسکے لیے گنجائشیں نونِ جہاں کی
خیال اس کا تھا جبریل اور قرآن تھا کلامِ اسکا

تصور میں بلندی فکر میں زورِ رسائی تھا

خدا کے بعد یہ دنیا میں حق دارِ خدا کی تھا

اسیرِ ذلت و نکبت مگر اب اس کی ہستی ہے
یہ ہو مغرورِ ماضی کی روایت اور حکایت
نہ اس میں صلہ پیدا نہ فکرِ انقاہ پیدا
یہ خاکی اب ہے مصروفِ ارتفاعِ مادیت
سکون کی کوششوں میں بے سکونی سانس لیتی ہے
یہ بھٹکا جا رہا ہے راہِ عرفانِ حقیقت کے
حکومت چاہتا ہے یہ فضاے نرم فانی پر
ستارے جانتا ہے ذرہ ہاے سوزِ دید کو
یہ برقی قلعے افلاک کی قندیل ہیں اسکو
زباں پر اسکی ہو ”معراج“ ذہنیت میں پتی ہے
یہ ہو مسرورِ ذکرِ عہدِ پارینہ کی لذت پر
نہیں صدیوں سے آثارِ نگاہِ آشنا پیدا
ہے اسکی سعی آوارہ سکونِ آدمیت میں
فریبِ عشرتِ باطل اسے امید دیتی ہے
یہ ہوتا جا رہا ہے دورِ اپنی فوضویت کے
نہیں جاتی نظر اس کی حیاتِ جاودانی پر
بساطِ کمکشائیں سمجھا ہو یہ خاکِ پتیدہ کو
یہ طیارے حرفِ شہرِ جبریل ہیں اسکو

عروجِ مادیت ہی اسے عرشِ الہی ہے مسلسل خواب ہے اور لعنتِ گم کردہ رہی ہے
 نہیں اسکی ترقی کے لیے کوئی جہت باقی کہ اب انسان میں مطلق نہیں انسانیت باقی
 الہی ذہن روشن، فطرتِ موانع دے سکو
 حقیضِ محض میں پھر قوتِ معراج دے سکو

عہدِ حاضر کے مسلمان

اوصافِ سلف سے مطلقاً صاف ہیں یہ پروردہٗ اختلاف و اسراف ہیں یہ
 ہے ان کا ہر اک عمل خلافِ اسلام اور کہنے کو اسلام کے خلاف ہیں یہ

ہے نام و نمود، دین و ایمان ان کا سرمایہ و اہرن ہے یزداں ان کا
 ہیں ان میں تمام غیر قومی اطوار یہ خود نہیں، تام ہے مسلمان ان کا

اے شیخ ذرا پکار دیوانوں کو آوازہٗ اسلام سے بیگانوں کو
 تبلیغِ اوروں کی پھر بھی ہو جائیگی کر پہلے مسلمان مسلمانوں کو

صفی لکھنوی



سفی اکمنوی

لہ

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا بچہ ذرا عمر رفتہ کو آواز دین

کوئی سیکھنے دل کی بیتا بیوں سے بچہ ہر انجام میں رنگ آغاز دین

صفتی لکھنوی عفا
۳۵۰۰ - ۱۹۴۲ء

صفی لکھنوی

سرگزشت

سید علی نقی نام، صفی تخلص، تاریخ ولادت ۳۰ جنوری ۱۲۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۸۵ھ، اور قدیم وطن لکھنؤ ہے۔ ان کے والد مولوی سید فضل حسین، آخری تاجدارِ اودھ کے بھائی شاہزادہ سلیمان قدر بہادر کے معتمد تھے۔

صفی ۵ سال کی عمر میں کتب نشین ہوئے اور مولوی نجف الدین کاکوروی سے فارسی، اور مولوی احمد علی محمد آبادی سے درسیات عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ فن طب کی تعلیم حکیم سید باقر حسین صاحب سے ہوئی۔ امین آباد نائٹ اسکول اور کیننگ کالج لکھنؤ میں انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد لال اسکول اور براہم اسکول متعلقہ کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ جون ۱۸۵۷ء سے اودھ کے محکمہ دیوانی میں منتقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، اور سلطان پور، رائے بریلی وغیرہ مقامات میں مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۸۶۲ء میں سرکاری ملازمت سے پینشن حاصل کی۔

جناب صفی، آزاد مسلک، نیک مزاج، خلیق، گوشہ نشین، اور

منصف مزاج شخص ہیں۔ ملی تعصب اور تنگ نظری سے دور کا بھی ٹکڑا نہیں۔ خلوص اور منکسر المزاجی ان کا خاص جوہر ہے۔ کم از کم سالی کے باوجود آواز میں ایک خاص کشش اور قوت ہے اور کلام پڑھنے کا طریقہ خاص ہے جو تحت اللفظ اور قزیم کے مین بین ہے۔

انجمن بہارِ ادب کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی شہرہء شہساز الہیات پر، ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد نے بحیثیت اعلیٰ نمونہ شاعری کے پانچویں کی رقم بطور صلہ مرحمت کی ہے۔ قومی نظموں کے اعتراف میں پبلک نے ”لسان القوم“ کا لقب دیا ہے اور کئی بار سلطانی تہنیت پیش کیے ہیں۔

فارسی کلام کا خاصہ مجموعہ ہے اور کافی تعداد میں متذوق نظمیں اور ایک ضخیم دیوان طبع ہو چکا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اصنافِ سخن میں غزل ایک ایسی چیز ہے جس میں سب آجاتا ہے، اگر سلیقہ اور ڈھنگ سے کہی جائے۔ ہندی اور سنسکرت کے جو الفاظ زبان میں رائج ہیں ان کا استعمال درست سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ کوششی ہونا چاہیے کہ حتیٰ ممکن سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں۔ کیونکہ اردو زبان شکیل اور غیر مروج الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

شعر کے لیے قافیہ و ردیف ضروری سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”شعر اگرچہ بغیر ردیف کے بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن ردیف کے بر محل استعمال سے شعر میں خوبی اور جستی پیدا ہو جاتی ہے۔ بغیر ردیف شعر کی مثال ایسی ہے جیسے بُنی ہوئی چادرانی بغیر دوپٹے کے۔“

نظم میں میر انیس اور غزل میں میر تقی اور غالب کو استاد سمجھتے
ہیں۔

انجمن نیرم سخن کی دعوتِ ادب میں مجبوریوں اور ضعیفی کے باعث
تشریف نہ لاسکے۔

انتخابِ کلام

رباعی

انسان کو اُس نے خاک سے پاک کیا ذی حوصلہ و صاحبِ ادراک کیا
پہلے تو بنا یا اسے گنجینہ علم پھر گنج کو پوشیدہ تہِ خاک کیا

رباعی

غمِ نقدِ حیات بوٹنے کو ہے یہ رشتہ عمر ٹوٹنے کو ہے
پیری میں کمر بھکی تو کیا دم کا قیام اب تیر کساں سے چھوٹنے کو ہے

غزل

طالبِ دید پر کچھ آئے منظور نہیں دل میں ہے در نہ وہ کبھی جو سطر نہیں
دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے کچھ دور مگر اس پہ بھی ملاقات انھیں منظور نہیں
ہم کو پروانہ و بلبل کی رقابت سے غرض گل میں وہ رنگ نہیں شمع میں وہ نور نہیں
خلیتِ دل نہ سہی کو کچھ شہرگ ہی سہی پاس نہ کرنے سہی آپ سے کچھ دور نہیں
ذوقِ پابندِ فانیوں ہے محرومِ حفا عشقِ مجبور سہی احسن تو مجبور نہیں
تالیشِ حسن نے جب ڈال دیے ہوں پردے ممکن آنکھوں سے علاجِ دلِ رنجور نہیں
لاؤ میخانے ہی میں کٹ نہ دیں اتنی رات مسجدیں ہو گئیں معمور یہ معمور نہیں
چھوڑ دے سازِ انا الحق جو دوبارہ برآ بزمِ رنداں میں اب ایسا کوئی منصور نہیں

کبھی، کیسے ہو صفی، پوچھ تو لیستا کوئی
دل دہی کا گراں شہر میں دستور نہیں

درِ آغازِ محبت کا اب انجام نہیں زندگی کیا ہے، اگر نوبت کا پیغام نہیں
کیجیے غور، تو ہر لذت دُنیا ہے فریب کون دانہ ہے یہاں پر چوتہ دام نہیں
بے تنزل کہ زمانے نے ترقی کی ہے کفر وہ کفر اب اسلام وہ اسلام نہیں
کون آزاد نہیں ملتہ بگوشوں میں تھے نقش کس دل کے نگینے پہ ترانام نہیں
نارِ سید ہے ترا میوۂ جنت زاہد پختہ مغروں کو تلاشِ ثمرِ حرام نہیں
یہی جنت ہے جو حامل ہو سکواںِ خاطر اور دوزخ یہی دنیا اگر آرام نہیں

شعر گوئی کے لیے بس وہی موزوں ہے صفی

جس کو حسرتِ فکرِ سخن اور کوئی کام نہیں

کوئی آباد منزل ہم جو ویراں دیکھ لیتے ہیں

بحسرتِ سوئے چرخِ فتنہ سماں دیکھ لیتے ہیں

نظرِ حسنِ آشنا ٹھہری وہ خلوت ہو کر جلوت ہو

جب آنکھیں بند کیں تصویرِ جاناں دیکھ لیتے ہیں

شب و عہد ہمیشہ سے یہی متول ہے اپنا

سرتک راہِ شوخِ سُست پیاں دیکھ لیتے ہیں

خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دور ہیں نظر

سوادِ کفر میں وہ نورِ امیاں دیکھ لیتے ہیں

دل بیتاب کا اصرار مانع شرم رسوائی
بچا کر سب کی نظریں سوئے جانان دیکھ لیتے ہیں
وہ خود سر سے قدم تک ڈوب جاتے ہیں پیسے میں

بھری محفل میں جو ان کو شیاں دیکھ لیتے ہیں
ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بے اختیار آنسو
جہن میں جب کبھی گل باغ خندان دیکھ لیتے ہیں
نگاہ ناز کی مستانہ یہ نشتر زنی کیسی

بوقتِ فصدِ رگن بھی رگ جاب دیکھ لیتے ہیں
اسیرانِ ستم کے پاسبانوں پر ہیں تانکیں
بدلتے ہیں جو پہرا قفلِ زنداں دیکھ لیتے ہیں

صغی رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے پہ آمادہ
مگر اُس وقت جب انسان کو انسان دیکھ لیتے ہیں

تڑپ کے رات بسر کی جو اک مہم سر کی	پھری گئی میرے لیے جو سکن بھی بستر کی
عرقِ عرق ہیں جو گرمی سو روزِ محشر کی	پناہ ڈھونڈھتے ہیں میرے دہنِ ترکی
ہوا گسان اُسی شوخِ مستِ پیمان کا	اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی
اسی طرف تڑے قرباں، نگاہِ شرمِ آلود	مجھی پہ تیز ہو یہ بارگاہِ کُندِ خبر کی
خرام وہ جو ہلا دے جگر فرشتوں کا	نگاہ وہ جو اُلٹ دے صفوں کو محشر کی
سجائی حضرتِ واعظ نے کس تکلف سے	متاعِ زہد و روعِ طیر صیوں پر نیر کی

عبورِ حقیقت سے جیب نہیں ممکن کنارے بیٹھ کے لہریں گنوں سمندر کی
 مٹنے لگا کون مٹنی جائے گی صفی کس سے
 تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھسرتی

فراق گورکھپوری

۱۱ مئی ۱۹۴۱ء



زاق گورکھپوری - اپریل ۱۹۵۶ء

جہاں میں بھی نعتِ ارفادہ تیرے جلوؤں کی چراغِ دیرِ درجہ جھلکے ہیں کیا کیا

علمِ حیات دہیں دورِ کاسات رہیں جو زندگی نہ بدل دے زندگی کیا ہے
تو سرِ عشق کا آغاز ہے میری زبانِ نام یہ سلسلہ تو سب دورِ تک پہنچتا ہے

کس کا کون سا بون تو لے لے جو بھی یہ حسنِ رشتی تو دور کا ہے سب۔ مگر جو بھی
ہزار بار ادھر کے زمانہ گئے رہے نئی نئی سسلی کچھ تیری گنگناتی ہے
آج تو کوئی عشقِ جبرک لٹا آج تو بول لٹھے ہیں بیتخانے

میں جب پر ہوا تھا وہ اشعار ہیں تمہاری تیرا
نماں تھا تیرے چہرے پر اک جذبہِ رقابت کا

میں کس کا دشمن نہ رہی تھی تیرے دنِ آدرش وہ تیری بار میں ہر پاتھ بھلے ہیں
کہاں ہر ایک کے بارِ نکٹا لٹھنا ہے بلا سرتی بھی محبت کے سر لگی ہوئی
کچھ گراں پرچہ ہے بارِ نکٹا آج دکھ ہے حسنِ نکٹا نے

رگھوپتی سہا خاق گورکھ پوری۔
مقامِ رامپور۔ ۱۹۲۱ء

فراق گو رکھپوی

سرگزشت

رکھوچی سہ ماہی نام، فراق تخلص، سال ولادت ۱۸۹۶ء اور والد کا نام، وکیل، گورکھ پرشاد، عبرت ہے۔

تقریباً چار سو سال سے گورکھپور میں آباد ہیں اور سری دوستیو کاپستھوں کے خاندان سے تعلق ہے۔ ان کے بزرگوں کو شیر شاہ نے پانچ کالوں باغیر میں دیے تھے، جو ہنوز آباد ہیں اور اسی باعث یہ پنجاب وال کاپستھ کہلاتے ہیں۔

فراق ساتوے رنگ کے چپت و تندرست، مذہبی قیود و تعصبات سے آزاد، روشن خیال اور منہں کھ انسان ہیں۔

مہولی گوردو پرچھ کر انگریزی کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۱۳ء میں گورکھپور سے انٹرنس اور ۱۹۱۵ء میں ایف، اے کا امتحان فارسی کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازیں شادی ہو گئی۔ بی، اے کے بعد والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور تفکرات دنیا نے آگھیرا۔

فرق ڈپٹی کمشنر بھی رہے، یونیورسٹی میں پروفیسر بھی، اور آئی، سی، این، کے بی بی نامزد ہوئے، لیکن ازدواجی زندگی نے اتنا بیدل کروا

تھا کہ حب وطن اور خدمتِ خلق کی خاطر تمام ملازمتوں سے انکار کر کے
۱۹۱۷ء میں کانگریس میں شامل ہو گئے اور قید و بند کی تمام مصیبتیں
جھیلیں۔ اس کے بعد کرسچین کالج میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔
آج کل الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار ہیں۔

ذوقِ شاعری لڑکپن سے تھا، لیکن سب سے پہلی غزل سنہ ۱۹۱۷ء
میں کہی، جب کہ بی، اے، میں تعلیم پا رہے تھے۔
اپنی شاعری کے متعلق فرمایا ہے کہ

”میں زیادہ تر امیرِ مینائی کا متبع ہوں، اور چونکہ عزیزِ کھنوسی، استاد
نظیم آبادی، ناصر، مولانا حسرت، اصغر، یگانہ، اور علامہ اقبال کے
ام کو اصلاحِ خیال کی نظر سے دیکھا ہے، اس لیے ان تاثرات
سے بھی کلام رنگین ہے“

ان کو دیگر اساتذہ کے حسب ذیل اشعار پسند ہیں:-

غالبؔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلقِ امیرِ خضر

نہ تم کہ چور بنے عرصہ جاوواں کے لیے

یگانہؔ پہاڑ کاٹتے والے زمیں سے ہار گئے

اسی زمین میں دریا سائے ہیں کیا کیا

کہاں وہم و گماں اتنے، حقانِ ہر طرف جتنے

نگاہِ نارسا، یہ نقدِ فطرت را یگاں کیوں نہ

حسرتؔ خلوص اب ہم یہ لائیں گے کہاں مکل کر حلقہٴ پیرِ مغان سے

”دیجیے عرضِ تنہا کی اجازت دیجیے

آپ فرمائیں گے جب خاموش ہو جاؤ گے

ان کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے وہ
 جملہ الفاظ استعمال کرنا چاہئیں جو مذاق سلیم پر گراں نہ ہوں۔
 نظم اور غزل دونوں میں علامہ آقبال کو استاد مانتے ہیں۔ کلام
 کا ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی سے اشعار
 کہتے ہیں، اور طرزِ جدید کے خلاف ہیں۔

انتخابِ کلام

کچھ اپنا آشنا کیوں اے دلِ نادان نہیں ہوتا
 کہ آئے دن یہ نگِ گردشِ دوراں نہیں ہوتا
 ریاضِ دہریں جھوٹی سہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
 گلستاںِ دہنل ہر غنچہ خنداں نہیں ہوتا
 یقیں لائیں تو کیا لائیں، جو شک لائیں تو کیا لائیں
 کہ باتوں میں تری پہ جھوٹ کا ارکان نہیں ہوتا
 سکوں نا آشنا رہتے ہیں رو کر بھی ترے حشری
 کہ دامانِ بیاباں، دامنِ جاناں نہیں ہوتا
 قسم تیری، تجھے پا کر بھی تجھ کو پا نہیں سکتے
 یہ عقدہ حل بھی ہو کر عقدہ آساں نہیں ہوتا
 خلوصِ عشق برنق، دیدہ پر خمِ بجا، لیکن
 غمِ ہجراں بھی سُنتے ہیں غمِ جاناں نہیں ہوتا
 نگاہِ اہلِ دل کے انقلاب آئے ہیں دُنیا میں
 یقیں رکھ عشقِ آتابے سرو ساماں نہیں ہوتا
 فضائلِ لاکھ ہوں، لیکن محبت ہی نہیں جہاں
 فرشتہ ہو، خدا ہو، کچھ بھی ہوا آساں نہیں ہوتا

نگاہیں آتشاکیوں جان کر انجان بنتی ہیں
 کیے جا اپنی سی تدبیر میں شاداں نہیں ہوتا
 اُمڈ آتے جو آنسو انقلاب اس کو نہیں کہتے

کہ ناداں ہر تہوج بحر کا طوفاں نہیں ہوتا
 فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ ساز دردیں لکین
 یہ دُنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

فسردہ پا کے محبت کو مسکراتے جا	اب آگیا ہے تو آگ سی لگائے جا
اس اضطراب میں از فروغ پہناں ہے	طلوع صبح کے مانند تھر تھرائے جا
جہاں کو دیگی محبت کی تیغ آبِ حیات	ابھی کچھ اور اسے زہر میں بھجائے جا
مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے	بگڑ بگڑ کے یونہی زندگی بنائے جا
وہ کیمیا ہی سہی، پہلے خاک ہونا ہی	ابھی تو سوزِ نہانی کی آہِ کھائے جا
ابھی تو اسے غم پہناں جہاں بدلا ہے	ابھی کچھ اور زمانے کے کام آئے جا
کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق سے	برت خلوص بھی جھوٹی قسم بھی کھائے جا
خلوص عشق کو کوڑا ورے غفلت پوش	کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا
شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے شاد	اُبھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا

فراق چھیر دیا تو نے کسبِ افسانہ درد

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سُنائے جا

لِ افسردوں کے اب وہ وقت کی گھاتیں نہیں ہوتیں

کسی کا درد اُٹھے جن میں وہ راتیں نہیں ہوتیں

ہم آہنگی بھی تیری دوری قربت نہ اٹھلی
 کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں
 یہ دورِ آسماں بدلا کہ اب بھی وقت پر بادل
 برسے ہیں مگر اگلی سی برسائیں نہیں ہوتیں
 زبان و گوش کی ناکامیوں کا کچھ ٹھکانا ہے
 کہ باتیں ہو کے بھی تجھ سے کبھی باتیں نہیں ہوتیں
 دو عالم اور ہی ہے جس میں گہری نیند آتی ہے
 خوشی و غم میں سونے کے لیے راتیں نہیں ہوتیں
 ارے واعظ تری رسم عبادت میں دھرا کیا ہے
 نگاہیں اہل دل کی کب منا جاتیں نہیں ہوتیں
 سمجھ کچھ رازِ حسن و عشق کے شہاے فرقت میں
 کہ رونے کے لیے یہ دکھ بھری راتیں نہیں ہوتیں
 سب کچھ اور ہے یا اتفاقاتِ زمانہ ہیں
 کہ اب تجھ سے بھی پہلی سی ملاقاتیں نہیں ہوتیں
 فراقِ اس دور کے اہل نظر سے ہے پیامِ بنا
 حقائق ہوتے ہیں اشعار میں باتیں نہیں ہوتیں

بلاے ناگمانی بھی پیامِ زندگانی بھی
 قیامت ہر قیامت یہ تیری اٹھتی جوانی بھی

شاکر ہم کو مٹ جاتا، غم بھی شادمانی بھی
 ازل ہی سے ہے یہ دنیا حقیقت بھی کہانی بھی
 پہاڑوں کی ہے سختی تو گزرا اس میں ہو دریا کا
 ملا وہ دل محبت کو جو پتھر بھی ہے پانی بھی
 نہ پانی راہ دل میں گو غم دنیا نے بھی لیکن
 کہاں ہے آج ایسی تیرے غم کی بیاہانی بھی
 غم دوراں کا رکھ کچھ دھیان اپنا غم سنانے میں
 کہ اک دن ختم ہو جائے گی ناداں کیانی بھی
 خطِ تقدیر اپنا پڑھ چکا ہوں بار بار لیکن
 نگاہِ یارِ آخر کوئی پیغامِ زبانی بھی
 گلستاں درگرہ لبِ شہنشاہِ درکنار نکھیں
 کہ ہر سبج بہاراں اس کا غم بھی شادمانی بھی
 نگاہوں کا وہ عالم دیدنی ہو جب جھلکتی ہے
 کسی کی زرخس معصوم میں کچھ یہ گمانی بھی
 ہمیں غش کھا گئے ہیں شعلہ آواز پر اپنے
 ہمیں نے بار بادی ہے صداتے نثرانی بھی
 عیب کیا اہلِ عالم اب اگر سہرورد ہو جائیں
 کہ کچھ کم ہو جلا ہے سوئے غم ہمارے سنائی بھی

نگاہِ ناز کے اُٹھتے ہی اے رنگِ رخِ جاناں

چھلکنا سیکھ لے تجھ سے شرابِ ارغوانی بھی

فراق اس دور کو دورِ عمل کہتے ہیں لیکن

رہے گی یادِ دنیا کو تری جادو بیانی بھی

سرمیں سودا بھی نہیں دل میں تنہا بھی نہیں	لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں
بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں	یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں
تم نے پوچھا بھی نہیں میں نے بتایا بھی نہیں	کیا مگر راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہیں	اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست	ہائے اب مجھ سے تجھے بخش بجا بھی نہیں
فطرتِ حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہم دم	چارہ ہی کیا ہے بحرِ صبر ہو تا بھی نہیں
نگہِ ناز کی نیت کا پتہ بھی نہیں اور	دل دیوانہ کا معلوم ارادہ بھی نہیں
بیخودی ہوش نہا ہوش بھی غفلتِ ما	ان نگاہوں نے انہیں کا مجھے رکھا بھی نہیں
یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانہ عشق	مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں
تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بیک	ہیں اتنا ناخدا آداب تماشا بھی نہیں
دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں	لیکن اس جلوہ گرِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں پہلو سزا	اور دل بحرِ نصیب آج تنگ کیا بھی نہیں

ہم اُسے صنف سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراق

دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

عشق کے ہاتھوں لے جاں دہیں باہریں رو گئیں تیری جنتیں وہ بھی کچھ یاد ہیں

عشق والوں کی نہ پوچھو شاد ہو کر باہیں
 بس انھیں کے فیض سے ویرانیاں آباد ہیں
 زندگی پر ایک تہمت ہی یہ نظم زندگی
 آج تک خونِ تناسل سے بسی بہنِ جنتیں
 کیا عجب مکھلے جو کارِ حسن بھی کارِ دردا
 یہ جھکی نظریں تری یہ زیر لب باتیں تری
 سو طرح آباد ہو کر سو طرح برباد ہیں
 ہر اداسے حسن میں سو عالمِ بیجا ہیں
 عشق پر جس طرح سب الزام لگایا ہے
 تیرے اٹھتے درد سے سینے ابھی آباد ہیں
 ہم اسیرانِ ستم قیدی بے بنیاد ہیں
 داستانِ دردِ استاںِ مُدادِ دُرُودا ہیں

رباعی

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے دُنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
 ہاں میسکہ جہاں کا ذرہ ذرہ سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے

کیفنی دہلوی

۲۲ مارچ ۱۹۴۱ء



کیفی دہلوی

مرکز ادب کا روح سخن را مید رہی
 یہ شمع وہ ہے جس کا زمانے میں نور ہے
 سب حکمران کے عدل و کرم سے ہیں چین میں
 میرے خیال میں تو یہ آرا مید رہی

برجموں داتا ترہ کی

۲۵ مارچ ۱۹۴۱ء

کیفی دہلوی

سرگزشت

برج موہن نام، اور کیفی تخلص ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت کنہیا لال ہے، اور قوم کے ذاتا تریہ پنڈت ہیں۔

ان کے بزرگ بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر سے دہلی آئے، اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے۔ پنڈت کنہیا لال نابھ میں کوتوال تھے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم محلے کے مدرسے میں ہوئی۔ فارسی کی تکمیل اپنے نانا سے کی، اور انگریزی کی تعلیم سینٹ سیٹیفنس کالج دہلی میں پائی۔

کیفی کوتاہ قد، موزوں اندام، گندمی رنگ، آفتابی چہرہ، فراخ چشم اور کشادہ پیشانی انسان ہیں، وضع قطع اور لباس انگریزی ہے۔ حافظہ نہایت قوی پایا ہے۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ دوپہر کو کبھی آرام نہیں کرتے اور شب میں گیارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے۔ حقے کا بھید بہ شوق ہے اور عموماً سادہ غذا کھاتے ہیں۔

خیالات کی بلندی، ہمدردی قوم و وطن، شاعرانہ شوخی و لطافت

اور وسعتِ اخلاق کا مجسمہ ہیں۔
 شادی، پنڈت اچودھیا ناتھ شیو پوری (دکھنؤ) کی صاحبزادی سے
 ہوئی تھی۔ بارہ سال کا عرصہ ہوا کہ ذہنیہٴ حیات کا انتقال ہو چکا۔ متعدد
 اولادوں میں سے اس وقت دو فرزند بقیدِ حیات ہیں۔

بڑے پنڈت پیارے موہن دتاتریہ بی، اے ایل ایل بی، اخبار
 ٹریبون کے فرسٹ ایڈیٹر اور چھوٹے سرنیدر موہن ایم، اے بی بی، ٹی لائن
 کالج میں پروفیسر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

جناپ کیفی کو شاعری کی دولت اپنے ایک خاندانی بزرگ پنڈت
 نراین داس ضمیر دہلوی سے ورثے میں ملی ہے۔ آغازِ مستق میں غزل
 گوئی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ پھر علامہ حالی، حضرت آزاد، اور مولانا شبلی
 جیسے اکابر کی صحبت اور مغربی ادب کے تاثرات سے نیمزل شاعری شروع
 کی۔ اصنافِ شاعری میں روحانی اور اخلاقی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

اردو ادب کی ترقی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

(الف) خواندگی بڑھائی جائے۔

(ب) سستی کتابیں کار آمد مضمونوں پر سہل زبان میں شائع کی جائیں۔

(ج) ایسے نشر کرنے والے ادارے قائم کیے جائیں، جو مقامی اور ملی
 تنگ نظری سے مبرا ہوں۔

(د) مقابلے کے مضامین اور نقیض وغیرہ لکھوائی جائیں اور انعام
 دیے جائیں۔

(ه) مُسلم ادیبوں اور مصنفوں کو جو آسودگی کے طالب ہوں سول
 پنشن عطا کی جائے۔

(د) فرانس ایڈیٹی جیسا ایک ادارہ قائم کیا جاتے۔
ان کے علاوہ اُردو کی خدمت کے اور بھی راستے ہیں جو کام
شروع کرنے سے خود بخود سامنے آجائیں گے۔

ان کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں ہندی اور سنسکرت وغیرہ
کے شمول کے جو اصول متوسطین کی نظر میں تھے، ہم کو بھی وہی سنا
رکھنا چاہیے۔ یعنی "تاریخ اور اپنانا" منشورات^۱ میں اُردو لسانیات کے
عنوان پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ ایسے الفاظ تعریف سے اجنبی نہیں رہتے
بلکہ اُردو میں گھل مل جاتے ہیں۔

ردیف و قافیہ کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان قیود میں
وہاں تک رہنا مناسب ہے جہاں تک مضمون ہاتھ سے نہ جائے،
اور شاعر کے تخیل کی مزاحمت نہ ہو۔ غزل میں ردیف ایک لطف
اور شان پیدا کر دیتی ہے۔

دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

ذوق اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مومن تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے ننہ پر ننی

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دلِ مرغِ مری نگاہ میں کون دسکاں کے ہیں

چھپ کر نہیں گئے مجھ سے وہ ایسے کہاں کے ہیں

زندگی کیا ہے خاص میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

نظم و نثر میں صرف سیلابِ اکبر آبادی کو استاد سمجھتے ہیں۔

نظم میں حسبِ ذیل کتب طبع ہو چکی ہیں :-

(۱) پریمِ ترنگی۔

(۲) سدس۔

(۳) بھارتِ درپن۔

(۴) آئینہ ہند۔

(۵) شوکتِ ہند۔

(۶) جگِ بیتی۔

(۷) وارداتِ دیوان۔

(۸) متفرق خمسہ کیفی۔

(۹) ناگزیرِ قیل و قال۔

(۱۰) خجائہ کیفی۔

(۱۱) مرآتِ خیال۔

۱۹۱۵-۱۶ء میں یورپ کا سفر کیا، اور علمی و ادبی حلقوں سے سربرآوردوں سے ملاقاتیں کیں۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریاست کشمیر میں اسٹنٹ فارن سیکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست چیتی (پہاڑی ریاست)

میں کلکٹر رہے اور اب دلی میں مولانا عبدالحق صاحب کے ساتھ ترویج
یہ ترقی اُردو کا کام کر رہے ہیں۔

فلسفہ حیات

کیوں سہم گیا جا کے تو گورستاں میں
متراناہیں، رہتا ہے ہمیشہ زندہ

گورستاں بھی ہے عالم امکان میں
ایثار ہو نہ سکی ہو اگر اناں میں

دن رات غم موت میں آئیں پھرنا
وس چھوڑ کے جیتے بندی، جاتا ہر ایک

ہے رب کی ودیعت کو معطل کرنا
فرمایئے جیسا ہے کہ ہے یہ مرنا

شباب اور پری

یہ شکوہ پہ شغلِ نوحہ خوانی کیا ہے
تو لہن سے مادر کے جوان نکلتا تھا

یہ ذکرِ فناءے زندگانی کیا ہے
پیری میں پھر افسوس جوانی کیا ہے

حوصلہ اور استقلال

آفات و مصائب سے کبھی منہ نہ مٹو
دل ٹوٹ گیا تو اس کا مشکل ہے جو

سے شک وہ آسمان اور قسمت سوا
جھڑ رتخہ کا لونا جیروں جا

عزل

فراہم ہو کے خون آرزو پھر دل نہ بن جائے
 یہ اجڑی پُرسکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے
 نہ ہو ہر موعے تن میں جھٹکا حساس اک گجھا کا
 تو جان بازی و جذبِ عشق میں کامل نہ بن جائے
 وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ڈرتے ڈرتے
 جو تیری ذات ہی اک پروہِ حائل نہ بن جائے
 جماعت کی مسلم قابلیت ہو تو کیوں کر ہو
 ہر اک فرد اس کا جب تک ہر قابل نہ بن جائے
 وطن کی ساکھ ہو تم توجوا لو کب یہ ممکن ہے
 کہ فخرِ حال و ماضی شانِ مستقبل نہ بن جائے
 بیجو م یاس و ناکامی میں گر بہت رہے قائم
 تو پھر کوششِ تمھاری سعی بے حاصل نہ بن جائے
 فہستے تک بھی حقائق سے ہارے ہیں بچ اس سے
 کہیں چاؤ زرخداں ہی چر بابل نہ بن جائے

زباں کے مسئلے پر یہ خدنگا نازیاں کہیں
 کہیں یہ خاک تو وہ گنبدِ بابل نہ بن جائے
 کبھی بحرِ محبت سے نہ بیڑا پار ہو اُس کا
 فراز موجِ طوقاں ہی جسے ساحلِ نہ بن جائے
 جواز خود رفتہ راہِ عشق میں ہیں ہو نہیں سکتا
 کہ منزل اُن کے حق میں دوری منزلِ نہ بن جائے
 تمہیں ہو رازِ دارِ عشق بس اب چپ رہو کتنی
 فسانہ اک جہاں کا وارِ داتِ دل نہ بن جائے

راحت کہاں نصیب تھی جواب کہیں نہیں وہ آسمان نہیں ہے کہ اب وہ زمیں نہیں
 ہو جوشِ صدقِ دل میں تو راحتِ نفل میں تھی قائم پھر آسمان رہے یا زمیں نہیں
 حبِ وطن کو ہمتِ مردانہ چاہیے درکارِ آہِ سینہ اند وہ گیس نہیں
 خونِ دل و جگر سے سینچاؤ غریزہ کشتِ وطن ہے یہ کوئی کشتِ نہ نہیں
 جنگِ وطن میں صدق کے ہتیار کا ہو کام درکارِ اس میں اسلحہ آہنیں نہیں
 جس بات پر غریزاڑے ہیں اڑے ہیں کتنے دیں انکو اونچے گلے سے نہیں نہیں

کتنی اسی سے حریتِ ہند میں ہے دیر
 حبِ وطن کا جوش کہیں ہے کہیں نہیں

حسن کی رنگینیاں سب جلوہ ساماں ہو گئیں
 دل کی آنکھیں سرسبز امینِ بداماں ہو گئیں

جب تعلق اور تعین سے ہوا آزاد دل
 پدغمتیں کہتے ہیں جن کو روحِ ایماں ہو گئیں
 مختلف آغاز سے نکلا بہت انجامِ عشق
 سب وہ دورانِ دیشیاں خوابِ پشیمان ہو گئیں
 رفتہ رفتہ اٹھ گئی معشوق و عاشق کی تیسر
 عشق کی مستِ کلیں اس طرح آساں ہو گئیں
 جلوہ بے پردہ تھا، فرطِ شوق نے ڈالی نقاب
 یہ نگاہیں مضطرب ہو کر پریشاں ہو گئیں
 حریت کیسی عمل کی جب محرک ہو غرض
 نینتیں آوارگی سے پا بجولاں ہو گئیں
 دولہو کی بوندیں رکھ چھوڑی تھیں چشمِ شوق
 وہ بھی اب آویزہ تارِ گریباں ہو گئیں
 جن امیدوں سے بنا تھا خانہٗ دلِ رشکِ غم
 اب وہی اس گھر کی بربادی کو طوفان ہو گئیں
 تھیں جو چیزیں ساری دنیا کیلئے حلِ اصول
 ہائے کیا قسمت ہے وہ بھی میرا رمان ہو گئیں
 ناز والوں کے سلوکوں نے کیا صبر آشنا
 بے نیازی کی ادائیں مجھ پہ احساں ہو گئیں

یاس ہے قطعِ عمل، امید تجدیدِ عمل

پھر بسیں گی بستیاں جو آج ویران ہو گئیں

تھیں وہ اگلی صورتیں محویت آرا کس قدر

دیکھ سٹے سٹے کر بھی زیبِ طاقِ نسیان ہو گئیں

حشر تک اہلِ جہاں وہم و گماں ہی میں رہے

دہر کی نیرنگیاں کیا فتنہ سا ماں ہو گئیں

کس قدر ررمِ شیوہ ہیں کتنی ادائیں حُسن کی

چھائیں عالم پر، کبھی سینے میں نہان ہو گئیں

شاعر کی تمنا

بزم میں آئے ہیں آج اک بات کہ جانے کو ہم

ایک گر بھولا ہوا، ہیں پھر سے بتلانے کو ہم

یہ نہ سمجھے کوئی، ہیں جد ہات بھڑکانے کو ہم

وہ نہیں جو یاس کے لے بیٹھیں افسانے کو ہم

ہم نہیں وہ جن کی امیدوں کا مرقد دل پہ ہے

ہم کو حاصلِ منفعت ہر سعیِ لاحاصل میں ہے

السلام اے نکتہِ سنج، اے شاعرِ شیوا بیاں

ایک انگوٹوں سے ترے مہور ہے سارا جہاں

اے تخیل کے دھنی اے والی علم و زباں
 آج کرتے ہیں تری خدمت میں کچھ ستائیاں
 ہم تمنا پر تری اک تبصرہ کرنے کو ہیں
 آج تیری آرزو کا تجزیہ کرنے کو ہیں

سب پہلے تو یہی ہو ایک تیرے دل کی جاہ
 مشعرے میں شعر پر تیرے ہو شور و واہ
 سب کہیں مضمون نیا، اسلوب کی دلکش راہ
 و رد ہو تو اس قدر، ہو سامعین کے لب پڑا
 تیرا ایک ایک لفظ بیٹھے دل میں اہل بزم کے
 تذکرے ہوں بزم کے یا مہر کے ہوں بزم کے

پھر یہی ہے نامتناہی تیری اے معجز قسم
 ہر سالوں پر ترا اور تجھ پہ ہو آن کا کرم
 اور پھر یہ چاہتا ہے تو، مرے اہل قلم
 صاحب دیواں بھی ہو جائیں کہیں جلد سے ہم
 جب ناک پڑیوں میں بندہ جانا نہیں تیرا کلام
 تو سمجھتا ہے کہ ہے محسوس و مبالغہ دوام

داعیہ تیرا بلند، اونچا ہے تیرا حوصلہ
 یہ تمنا ہے ترے دل میں یہی ہے ولولہ

ہر کہیں دُنیا میں ہو تیرے سخن کا غلغلہ
 مات چورن والے کی بانی ہو جس سے بڑا
 تجھ سے سنا کے ستاروں کی بھی شہرت مانڈو

چرخ پر تشہیر کے تو چودھویں کا چاند ہو
 تجھ کو اٹھتی ہے تصوف کی ہرک بھی گاد گاہ
 اولیاء اللہ کا بن بیٹھا ہے خضرِ راہ
 جو سنا ہے یا پڑھا کرتا ہے خوب اُس کا نباہ
 تو خدائی اور خودی دونوں کو کرتا ہے تباہ

مادیت کی ترے پیروں میں گوزنِ بخت
 پر سخن دیکھو تو مستراں، وید کی تفسیر ہے

حُسن جس کا راگ تو گاتار ہا شام و سحر
 عشق گھائل جس سے تو کہتا ہو دل ہو درِ جگر
 ہجر جس نے کر دیا ہے تجھ کو مردہ سے بہتر
 وصل جس کے پیچھے سرگرداں رہا تو عمر بھر

اصلیتِ ان کی ہے جو کچھ سب ہمیں معلوم ہے
 تو نہیں مجنوں جنونی عاصی معصوم ہے

تو غلو سے کام لے اے دوست یا مطلق نہ لے
 راہ پر تو واقعیت کی، کہ فطرت پر چلے

گاتے یاد کھلاے تو کتھک کے فن کے چوچلے

یہ جو کچھ بھی ہیں فقط ہیں ابتدا کے مرحلے

ابتدا ناقص ہے تیری انتہا بھی نادرست

مبتدا بے ربط ہو تو ہو خبر کس طرح حبت

وہ تمنا کیا ہے جو ہو فرض - یہ نا آشنا

برق رفتاری وہ کیا جب بوجہ کندھے سے گرا

نغمہ وہ کیسا ہے، بادی سر ہو جس کا بے پتا

کیا وہ نقاشی ہے جب ہو کارٹون اسپر فدا

تو ہی کہ وہ کیفیت جو تجھ پہ وارد ہی نہیں

کیا سر و کار، اُس کی عکاسی سے تجھ کو، نکتہ یں

یہ ترے افعال اور تیری تمنائیں فصول

تجھ کو ٹھہرا کر رہیں اس جون میں اپریل فول

- ایک ہی پھینٹے میں بہ جائیں گے یہ کاغذ کے پھول

کام کی اک بات تہلاتے ہیں سن اسکو نہ بھول

تجھ کو حاصل ہو وہ فن جس میں ہے جادو کا اثر

چھوڑ وہ وہی تمنا آدھری کچھ کلام

تجھ کو تو تحنیل عالی پر بہت کچھ ناز ہے

مرستی کا در ترے منہ پر ہمیشہ باز ہے

جذب اور تاثیر سے بھی تجھ کو سوز و ساز ہے
پھیننے میں دل کے تیرا کلک سحر انداز ہے
اُسٹھ یہ میدانِ عمل ہے دوست تیرے سامنے

قوتوں سے اپنی خدمت میں وطن کے کام لے
حریت قطعاً سیاسی اور ملکی ہی نہیں
حریت دنیاوی آزادی و دینی ہی نہیں
حریت ایمان کی اور اعتقادی ہی نہیں
حریت خود اختیاری اقتصادی ہی نہیں

حریت تکمیل کی بھی ایک حقیقتی چیز ہے
اس کو حاصل کرو اگر تجھ کو ذرا تمیز ہے

یہ تنہا جب ترے سینے میں گھر کر جائے گی
جو شخص کی تجھے حسرت ہے وہ مر جائے گی
کل فضا اپنے وطن کی اسن سے بھر جائے گی
جو بڑی ساعت وطن پر ہے، مقرر جائے گی

کاشکس یہ دُھن پہ تجھے، یہ ہی تنادل میں ہو
جوش اُخوت اور حب کا دلیں کی محفل میں ہو

پس تو یہ ہے سچے شاعر کی تمنا ہے یہی
کردے کوثر سے جو ستغنی رہ صبا ہی یہی

نیں سے روشن ہو جہاں وہ طورِ سینا پر ہی
 ست کر دے انس و جاں کو وہ ترانا پر ہی
 اُٹھ ہلا دے تو غریبوں کے دل بے جوش کو
 صویرِ اسرافیل کر دے بربطِ خاموش کو

ماہر القادری

۱۳ جنوری ۱۹۴۱ء



ماهر القادری

نغمہ رنعتی

مسوزِ ناتمام

دہی قتل کی پشیمانی وہی جو صد کی مایوسی : نہ وہ جراتِ ملیں نہ وہ ذوقِ ہمدردی
میں دردِ شب کی فطرت جو بدل سکے بدل دو : نہ کہہ نہیں قبولِ کج کو نہ اسپر کی مٹلائی
میں نہ مایوسیوں کہہوں بجز مری خاشی ہے سب کچھ : مری ہر نغمہ گزارش مرا ہر نفسِ سیاسی
میں مسوزِ دل کی قیمت افسانہ اک نگاہِ اُلفت : نہ تیرے دردِ دل کا مسوزا ہی غنیمتِ برداری
نئے کاروان کی مطبعت ہے تمام تر سیاست : نہ مہدی کی اب فردت نہ وہ درجہِ خوشخوار
مجھے کیا پیام کی تری زندگی کی دنیا : نہ کہ فنا کی وادیں ہیں مجھے دی گئی سلام
میں وہاں یہ طلبِ پرامن عشرت ہی آگیا : ابھی تو بھل کر رہا ہے مرا مسوزِ ناتمامی
مجھے ڈر ہے کالجوں کو نہ خراب چل کر : یہ غمِ دورِ علم و دانش یہ جنوںِ بچتے کامی
مجھے زندگی کی خاطر نہیں دینے گوارا : مجھے راسخِ قیمت کی گتے سرت ہے غلّی

میں دل نے آج ماہر کو بیکار
یہ نگاہِ رستِ مسوزا ہے سرِ بلبِ بار

بہارِ نغمہ
۶ مارچ ۱۹۸۶ء

عاشقِ القادری

ماہر القادری

سرگزشت

منظور حسین نام، ماہر تخلص، سال ولادت ۱۳۲۲ھ اور وطن
قصہ کسیرکلاں ضلع بلنڈ شہر ہے۔ ان کے والد محمد معشوق علی، ظریف
تخلص کرتے تھے اور حمد و نعت لکھا کرتے تھے۔

نسباً شیخ قریشی اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد میں ہیں
خود فرماتے ہیں کہ ”ہمارے خاندان کی تاریخ امارت و دولت کی روایت
سے خالی ہے، اور مجھے فخر ہے کہ میں امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوا۔“
سات سال کی عمر میں والدہ کا اور اٹھارہ سال کے سن میں
والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

ادل گانوں کے مکتب میں قرآن مجید ختم کیا۔ پھر والد سے اردو
فارسی پڑھی۔ ریاضی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد سے
میٹرک میں شریک ہوئے، مگر فیل ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ سے
میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد تلاشِ معاش کی فکر میں گرفتار
ہو کر بظاہر تعلیم ترک کر دی، لیکن معاً مطالعے کا سلسلہ بدستور جاری
رہا۔ چونکہ علوم و آداب سے فطری مناسبت ہے، اس لیے مذہب،

اور تاریخ کا خاص مطالعہ کیا ہے۔

ماہر کی آواز میں پُر اثر سخن ہے۔ خوبصورت خط و خال اور بلند پایہ قد ہے۔ چہرے سے منانت و سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ افلاق میں وسعت، اور مزاج میں سادگی ہے۔ بزرگوں سے عقیدت مندی، اور غریبوں کی پوجہ و رشتے میں ملی ہے۔

شاعری میں تلذذ کسی سے نہیں اور نہ صلابت سخن کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری کا وہ پلو اہم ہے جس کے ذریعے قلب میں تسکین اور روح میں انقلاب پیدا ہو سکے۔ یہ اقتصادیات اور مسائل وغیرہ کی رہنمائی سے شاعری کو بالاتر سمجھتے ہیں۔

کلام میں ردیف و قافیہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور بنفیر ردیف و قافیہ کی شاعری کو جس کا نام لوگوں نے ”ترقی پسند شاعری“ رکھا ہے، دماغی پستی اور ذہنی غلامی کی آخری سرمد جانتے ہیں۔

ان کے نزدیک ہندی اور سنسکرت کے فرید الفاظ کا غول ناروا ہے۔ اور مروجہ زبان میں کسی قسم کے تنقیر کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُردو ادب کی سب سے بڑی خدمت اسے جانتے ہیں کہ اُردو سے ذوق رکھنے والے ہر مہینے کتابیں خریدنا اپنے ادب پر فرض کر لیں۔ اس طرح مصنفین کی بہت افزائی ہوگی اور اچھی اچھی کتابیں منظرِ عام پر آسکیں گی۔

علامہ اقبال کے یہ چند اشعار ان کو بہت پسند ہیں :-
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اہم کیا شمشیر و سناں اول، طاؤس و ربابِ آخر

ترسے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

کر بلبل و طاؤس کی تہہ سے تو یہ بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

آخر شب وید کے قابل تھی لعل کی تڑپ صبح دم کوئی اگر بالاسے بام آیا تو کیا

ترسے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

نہیں ہونا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا غم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ احرم نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعیل

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست تیرہ جاتی ہے جنگیزی

عجب ہے شکوہ تقدیرِ نیرواں تو خود تقدیرِ نیرواں کیوں نہیں ہے

جسے ناب جوین بخشی ہو تو نے اُسے بازوے حیدر بھی عطا کر

ظہورِ قدسی، محمد و ساتِ ماتہر، ماہرِ قادری کے سو شعر، یہ تین مجموعے
منظوم کلام کے شائع ہو چکے ہیں۔ مصروفیاتِ معاشی کی تنگ و دوکے
بعد جو وقت بچتا ہے، کتابیں دیکھنے اور نظم و نثر لکھنے میں صرف کرتے ہیں۔

۳۳ء میں سفر عراق کیا، اور بغداد شریف میں ایک ماہ رہ کر
 ایک نظم بعنوان ”بغداد کے جہن میں ایک شام“ لکھی جو مشہور ہے۔
 کلام زیادہ تر از بر اور کلام پڑھنے کا طریقہ ہمید دل کش ہے۔

انتخابِ کلام

جہنا کا کنارہ

ساون کی گھٹا اور وہ جہنا کا کنارا
 جاسن کے درختوں سے جو کچھ آگے بڑھایا
 اندر سے اٹھلائی ہوئی چال کی شہی
 نکھرے ہوئے ماتھے پہ وہ رنگین قشقہ
 قشقے پہ وہ چاندی کا چمکتا ہوا جھومر
 لہریں جو قریب آئیں تو دامن کو سنبھالا
 پہلے تو ہر اک شے کو بڑے غور سے دیکھا
 پردوں کے کڑوں کو کبھی پھوپھوں کو گھمایا
 پانی سے چھلکتی ہوئی گاگر کو اٹھایا
 آتا مجھے دیکھا تو وہ تھکی کبھی ٹھٹکی
 دیکھا نہ گیا حُسن کی مجبوری کا عالم
 اُدبکدہ ہند کے بے ترشے ہوئے بُت
 وہ منظرِ دل چپ وہ رنگین نظارا
 آئی نظر آتی ہوئی ایک شعریہ دل آرا
 ٹرک جاتے جسے دیکھ کے ہوتا ہوا دھارا
 جس طرح گھٹاؤں میں دکھتا ہوتا را
 جس طرح کہ انگارے پر پٹھرا ہوا پار
 اک ہاتھ سے نقشین سی گاگر کو اُتارا
 پھر جھٹکے بڑے ناز سے ہاتھوں کو نکھارا
 گاگر کو اُجالا کبھی بالوں کو سنوارا
 لیتے ہوئے معصوم اداؤں کا سہارا
 شاید مرا آنا نہ ہوا اُس کو گوارا
 میں اُس سے یہ کہتا ہوا بستی کو سہارا
 بخشم بہ نگاہ تو سمرقند و بخارا

کیبار باین نازِ بیا بر لبِ جہنا

یک فرصتِ نظارہ بدہ بازِ خدا را

فرصت آگئی بھی دی لذت بخودی بھی دی
 موت کے ساتھ ساتھ ہی آپنے آگئی بھی دی
 سوزوروں عطا کیا، جراتِ عاشقی بھی دی
 اُن کی نگاہِ ناز نے غم ہی نہیں خوشی بھی دی
 اُس نے نیاز و ناز کے سارے ورق لٹا دیے
 دستِ غلیل بھی دیا صنعتِ آذری بھی دی
 پھر بھی مری نگاہ میں دونوں جہاں سیاہ تھی
 میری شبِ فراق کو چاند نے روشنی بھی دی
 آپ نے اک نگاہ میں سب کو نہال کر دیا
 پھول کو مسکرا سٹیں، سوج کو بے گلی بھی دی
 چھین لو مجھ سے دوستو طاقتِ عرضِ مدعا
 اس نے مزاجِ یار کو دعوتِ برہمی بھی دی
 دامِ تعینات میں دیدہ و دل اُلجھ گئے
 سوزِ یقیں کے ساتھ ساتھ لذتِ نافر بھی دی
 مآہرِ دل نگار پر آپ کی یہ نوازشیں
 فطرتِ عاشقی بھی دی، دولتِ شاعری بھی دی
 کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے
 دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے
 دردِ بدنام، تمنا رسوا،
 عشقِ رسوائی ہی رسوائی ہے
 اُس نے پھر یاد کیا ہے شاید
 دل اڑھٹکنے کا صدا آ رہی ہے

زلف و رخسار کا منتظر تو بہ، شام اور صبح کی یکجہائی ہے
ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے چشم آئینہ تماشائی ہے
دل تناسے ہے کتنا بیزار ٹھوکریں کھا کے سمجھ آئی ہے

تم سے ماہر کونہیں کوئی گلہ
اُس نے قسمت ہی بُری پائی ہے

وہ نہیں ہنس کے وعدے کیے جا رہے ہیں فریب تنادے جا رہے ہیں
ترا نام لے کر جیے جا رہے ہیں گناہ محبت کیے جا رہے ہیں
مرے زخمِ دل کا مقد ز تو دیکھو نگاہوں سے ٹانگے دی جا رہے ہیں
نہ کالی گھٹائیں نہ پھولوں کا موسم مگر پتے والے پیے جا رہے ہیں
تری محفلِ ناز سے اُٹھنے والے نگاہوں میں تجھ کو لیے جا رہے ہیں
مرے شوقِ دیدار کا حال سن کر نیامت کے وعدے کیے جا رہے ہیں
حریمِ تجلی میں ذوقِ نظر ہے نگاہوں سے سجدے کیے جا رہے ہیں

ابھی ہے اسیری کا آغاز، ماہر
ابھی تو فقط پر سے جا رہے ہیں

کچھ اس طرح نگاہ سے اظہار کر گئے جیسے وہ مجھ کو واقف اسرار کر گئے
اقرار کر دیا، کبھی انکار کر گئے بیخود بنا دیا، کبھی ہشیار کر گئے
یکتا ئیِ جمال کی حیرت نہ پوچھے ہر ماسوا کے وہم سے بیزار کر گئے
کچھ اس اداسے جلوۂ معنی کی شرح کی میرے خیال و فکر کو بیکار کر گئے
اللہ ہے اُن کے جلوۂ رنگیں کی فطرتیں سارے جہاں کو نقش بدیوار کر گئے

وعدے کا اُن کے ذکر ہی مآثر فضول ہے
تم کیا کرو گے وہ اگر انکار کر گئے

دور رہ کر بھی مرے نزدیک آتے جائیے	نہیں میں دل کی بیانی بڑھاتے جائیے
دیکھنے والوں کی نظریں آزماتے جائیے	اک ذرا تھم تھم کے پردے کو اٹھاتے جائیے
ہو سکے تو میری خاطر مسکراتے جائیے	میرے اس طلسمت کد کو جگمگاتے جائیے
دیکھنے والوں کی نظریں آزماتے جائیے	پھر اُسی انداز سے نظریں ملاتے جائیے
یا پھر اپنی یاد سے غافل بناتے جائیے	یا کوئی تسکین کی صورت بتاتے جائیے
حُسن کی دلچسپیوں کے کام آتے جائیے	رفتہ رفتہ خود کو دیوانہ بناتے جائیے
جاتے جاتے آج اس کو بھی بھجاتے جائیے	رہ گیا ہے آرزوؤں کا لرزتا سا چراغ
دل یہ کہتا ہو فریبِ ست کھلتے جائیے	عقل کہتی ہو دوبارہ آزمانا جہل ہے
اُن کے ہر انداز پر ایمان لاتے جائیے	کنفروایاں کے سوا بھی کچھ مناظر اور ہیں
ہر طرف اُمِّ سُرُخِ یلے بھجاتے جائیے	آہی جائے گا کوئی قسمت کا مارا نہیں بھی
میری ہر شکل کو شکل تر بناتے جائیے	میں نے کچھ فطرت ہی پائی ہو عجب شکل پسند

یاد ہے مآثر مجھے اُن کا وہ کہنا یاد ہے
آج تو بس رات بھر غزلیں سناتے جائیے

تلوک چند محروم

۲۲ نومبر ۱۹۴۱ء



ٲاؤك چنء مءروم

محروم! مصلحت کہ ہمیں انتظار کیا زندہ کریگی مردوں کو بار بار کیا؟

غم تازہ ہے دل مراد کا، الم آرزوئے سرہ کا

ترہیز ہوا میں دیکھ دیکھ کے اسلام نے منے!

عالمِ روا رومی کا آئینہ نیر کیا دنیا میں ہے لشکر مسافر میں ہے!

ہے خاتمہ قریب جانی کی رتنا کا محروم بہر فائدہ زلف بیاں چھیر

سنب بجراں کی صورت دن ڈھلے سے بہر نظر آئی

الہی بھجدے صبح قیامت شام کے بدلے!

پر ہے نور سے زیت کا دیا نا نخدا اں کو یہ تر اں س

دل میں کچے ہیں کہ کے ماش آئے ہوتے اُن کے آئینے جو بیار کا مال ابھا

جن اند جن عین جاک نہر سے تیرا مگر دے مری نزل بیا بیا ہے

کون فائدہ ہے دنیا ے دفا میں بیل! جو ہے بہر ہی اک تو ہی تو بہر ہیں

بیدار کے یے ہیں مکن اگر خوب جو کچھ ہے موا ہے دل بیدار کے ہے

مقامِ رامپور - ۱۳ نومبر ۱۹۴۱ء
تکوپ چند محسوس

تلوک چند محروم

سرگزشت

تلوک چند نام، اور محروم تخلص ہے۔ ۱۸۵۵ء میں موضع عیسیٰ خیل ضلع سیال والی (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد اصلاً زراعت پیشہ تھے۔ لیکن آراضی دریا برد ہو جانے سے دکان داری اور بیوپار شروع کر دیا تھا۔

جناب محروم نے پہلے ورنا کیولر مڈل اور ۱۸۷۵ء میں انٹرنس، پھر ایف، اے، اور بی، اے اور ایس، اے، دی، کے امتحانات نجی طور پر پاس کیے۔ ۱۸۷۸ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی، اے، دی کا امتحان پاس کرنے پر سن ہائی اسکول ڈیرہ اسماعیل خاں میں بطور جونیئر انگلش ماسٹر مقرر ہوئے، ۱۹۱۲ء میں بھارتی ہائی اسکول ڈیرہ اسماعیل خاں میں چلے آئے، اور ۱۹۱۶ء میں بوجہ وفات اہلیہ عیسیٰ خیل میں آکر مینیپل بورڈ اسکول میں اول سکنڈ ماسٹر اور بعد میں بطور ہیڈ ماسٹر ۱۹۲۵ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک ڈیل اسکول کلپور کوٹ ضلع میانوالی میں ہیڈ ماسٹر رہے، اور ۱۹۳۳ء سے آج تک کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

مگر عنقریب پشہن پر سبکدوش ہونے والے ہیں۔
 دورانِ ملازمت میں حالات ناسازگار رہے جس کا اظہار ان اشعار
 میں کیا ہے۔

سی و چار سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد سحرِ شبابِ خود را بہ تیرہ شامِ کرم
 شرفِ بھسِدِ پیری چہ بود کہ در جوانی بہ سگاں ادب نمودم، بہ خواں سلام کردم
 طبیعت میں سوز و فطری تھی۔ فرماتے ہیں کہ:-

”تیسرے کلاس میں پڑھتا تھا کہ خود بخود مصرعے زبان پر آئے۔ لگے۔
 چونکہ مادری زبانِ ملتانہی ہے، صحیح اُردو سے لڑکپن میں واقفیت
 نہ ہو سکی۔ وہ زمانہ تو دُور رہا۔ آج تک روزِ مرہ اہل زبان پر قدرت نہیں۔
 جنابِ محروم چھریے جسم کے تباہی چہرے اور مناسب تدوائے
 فراخ چشم، کشادہ پٹائی اور تین شاعر ہیں۔

ان کا خاص موضوع، اخلاقی، اور اصلاحی تھیں ہیں، جن سے
 بچوں اور نوجوانوں کی اصلاح و تعلیم کا کام یا جا سکتا ہے۔ اور یہی
 ان کی شاعری کا اہم پہلو ہے۔

دیگر زبانوں کے غیر مانوس الفاظ، خواہ ہندی یا فارسی کے ہوں
 یا سنسکرت اور عربی کے، اُردو میں استعمال نہیں کرتے۔ لیکن جو الفاظ
 گھل مل گئے ہیں، اور سانس کو اُن کے سمجھنے اور سُنے میں گرائی نہیں
 ہوتی، انھیں اشعار میں لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ زبانِ اُردو کی وسعت کے لیے عربی و فارسی
 اور دیگر زبانوں کے رواں تریجے کیے جائیں۔

کلام میں ردیف و تانیہ کی پابندیوں کو لازم قرار دیتے ہیں۔

اس لیے کہ اس التزام نے اشعار کا لطف بڑھ جاتا ہے اور رنگینی آجاتی ہے۔

تلمذ کسی سے اختیار نہیں کیا، لیکن نظم میں چلبست، سرور جہاں آبادی، اور علامہ اقبال کو استاد مانتے ہیں، اور غزل میں میرزا غالب اور تیر کے قائل ہیں۔

دیگر اساتذہ کے یہ اشعار ان کے زبان زد ہیں :-

کل گئے تھے تم جسے بیارِ ہجراں تھپوڑ کر

ذوق

چل بسا وہ آج سب ہستی کا سماں چھوڑ کر

لیکن

میر نیرنگ تو دوانے ہیں

میر نیرنگ

ان کی باتوں پہ نہیں جانیے گا

لب لب ہے آج تجھ سے تیرے دیوانے کی خاک

آسی

خوب پہچان اے بت مے نوش پیمانے کی خاک

واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلاسکو

غالب

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

مکن نہیں عملائقِ دنیا سے چھوڑنا

ذوق

جب تک کہ روح کو ہے تعلق بدن سے تھ

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے لب لب

اقبال

یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

ان کا منجملہ اربابِ وفا ہو جانا

بیانِ یزدانی

میرے نزدیک ہر بندے کا خدا جانا

۱۹۱۳ء میں ایک مجموعہ ”مکالمِ محروم“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد ”کلام محروم حصہ دوم“ شائع ہوا۔ مشعل میں ایک اور ضخیم مجموعہ ”گنج معانی“ کے نام سے طبع ہوا ہے۔

اکثر نظمیں مدارس اور اسکول کے چھوٹے بڑے درجات کی دس کتابوں میں داخل ہو چکی ہیں۔

متاہل زندگی کی یادگار دُرُودِ لڑکیاں اور ایک لڑکا جگنا تھ آرزو (بی، اے) باقی ہے۔ آرزو کی طبیعت کو بھی شعراء سخن سے خاص لگاؤ ہے۔

انتخابِ کلام

قطعہ

اگرچہ ہم نکل آئے ہیں گھر سے دہشت
ہمیں ذرا غمِ غربت کہ رام پور آئے
یہ وہ جگہ ہے کہ پاتا ہے دل سرورِ حیاں
یہ وہ مقام ہے آنکھوں میں جس کو نور آئے

غزل

ہم دل جلوں کو ای بُتِ نامہاں نہ چھیڑ
بھڑکے گا اور شعلہ سوزِ نہاں نہ چھیڑ
صیادا و خزاں کے ستم اس پہ کم نہیں
تو عنذِ لب زار کو اے باغباں نہ چھیڑ
ہے، ہے! کسی کی بزم مجھے یاد آگئی
واعظِ خدا کے واسطے ذکرِ حباں نہ چھیڑ
دنیا میں اے زباںِ روشِ صلح کل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو بچ ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ
بہم کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اٹھے
ایامِ حسن و عشق کی پھر دستاں نہ چھیڑ

سہ خاتمہ قریب جوانی کی رات کا

محروم، پھر فسانہ زلفِ بتاں نہ چھیڑ

رہی فراق میں بھی آکلِ روبرو تیری
شبِ بے کھینچی تصور نے ہو ہو تیری
معاف رکھ جو ہر گناہے تر سے پیار مجھے
کہ ان میں رنگِ ترا کچھ ہے کچھ ہو تیری
نسیم صبح کا جھونکا نفسِ تیرا
رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری
یہ فخر کم نہیں ہم لائقِ خطاب تو ہیں
عزیز اور کے انقاب سے ہے، تو تیری

دہانِ غنچہ تر سے زبانِ سوسن سے جن جن میں شنی میں نے گفتگو تیری
دل و جگر ٹھکے جاتے ہیں سوزِ ہجر اس لگنِ عذاب ہوئی مجھ کو شمعِ روتیری
کہاں کہاں ترے محروم کو بقولِ سرور
کشاں کشاں لیے پھرتی ہے جستہ تیری

کچھ نئے داغ کچھ پُرانے ہیں آج ان کو سبھی دکھانے میں
پُر ہے نوجوں سے زلیست کا دیواں ناستخداں کو یہ ترانے میں
کوہِ صحرا و ساحل و دریا بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں
عمرِ اناں ہے ایک لحظہ، مگر اس میں کیا مختلف زمانے ہیں
برے ذکر و فناءے یلے پر یہ حکایات ہیں، فسانے ہیں
لے جلا دل کسی کی محفل میں موت آنے کے سو جانے میں

ہم بھی ایسے نئے نہیں محروم
یہ جفا میں اگر پُرانے ہیں

نفس اور اس میں لیں افسردہ و ناشاد ہم خانہ پروردِ جن میں آخر اے صیاد ہم
پھر بہار آئی، ہوئے پھر مائلِ فریاد ہم کرتے ہیں کینچِ نفس میں بزمِ گل کو یاد ہم
ریشکِ جنتِ فصلِ گل میں ہیں فضا میں دہری اور نفس میں مضطرب ہیں اشیاںِ بر یاد ہم
ہم صغیرِ ان جن سے جا کے کہنا اچھا یہاں ہیں کوئی دم کے کشتہ بیداد ہم

یادِ نسرین و سمن میں دل پہ لاکھوں داغ ہیں

مثلِ محرومِ خزیںِ غربت میں ہیں ناشاد ہم

ہم جواہ و فغاں نہیں کرتے آپ کا استغنا نہیں کرتے

جانِ دل دیکے عاشقانِ غیور ناز بردارِیاں نہیں کرتے
 روزِ نامہرِ بانسیاں ہم پر یوں تو اے مہرباں نہیں کرتے
 جنسِ تابیاب ہو دلِ بیتاب پھر بھی اس کو گراں نہیں کرتے
 عقل کو کیوں بتائیں عشقِ کاراں غیر کو رازِ داں نہیں کرتے
 زندگانی ہے آن پر مرنا مرد پر وائے جان نہیں کرتے

یا دایم شوق سے محروم

دل کو اب ہم تپاں نہیں کرتے

عشق کی دُنیا میں جنسِ غم کو ارزاں کر دیا

ہم غریبوں کے لیے جینے کا سا ماں کر دیا

زسیت کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا

موت سی مشکل کو میرے حق ہر آساں کر دیا

حُسن کی جاں بخشیاں دیں تو نے اچھوٹے کفر میں

آہ لیکن پھر اُسی کو دشمنِ جاں کر دیا

میں توجبِ جانوں کہ میرے دل کی بیباکی مٹے

کیا ہوا اگر آئے کو تم نے حیراں کر دیا

کر دیا ظاہر وہ کچھ جس سے پریشاں ہو نظر

جس سے ہو سکیں دل وہ رازِ پتہاں کر دیا

شوق سے جا کر علاجِ کشتگانِ شوق کر

دل کو ہم نے بے نیازِ درد و درماں کر دیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانہ ناکام شوق

جس نے جو چاہا الگ تجویز عنوان کر دیا

باعثِ انبساط ہو آید نو بہار کیا رنگِ چین دکھائے گاسینہ داغدار کیا

عہدِ پہ اعتماد کیوں، وعدے کا اعتبار کیا رکھے امید کس لیے یکجہ انتظار کیا

تلخ ہے زیست، کیسے کیسے لیے تلخ ترا خرمی گزشتہ کو روئیے بار بار کیا

شامِ وصال سے ہوں کیا مجھِ فریبِ آرزو یاد نہیں رہی ہیں صبحِ دلِ عیار کیا

طبعِ سنووری تلک کا ن گھر سے کم نہیں

سامنے شعرِ تر کے ہے گوہرِ آبدار کیا

ہر نظرارے میں ہیں سو پر تو جاناں پیدا کیوں نہ ہو دیکھنے والے میں نئی بیاں پیدا

طرپل سے بیا بیاں بھی ہو رشکِ گلشن دل ہونا خوش تو ہو گلشن میں بیا بیاں پیدا

جنکی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم ہم ٹہنگاروں میں ہوتے ہیں وہ انسان پیدا

کر ہی ڈالے گی ہوا سے چینِ ہر لول صورتِ گل بھی اگر کوئی ہو خداں پیدا

ظلمتِ یاس میں امید کی نہاں تھی جھلک پردہٴ شب ہو انیرِ تاباں پیدا

غیب سے ہمتِ مردانہ کو ملتی ہو مدد غمِ راسخ ہو تو ہو جاتے ہیں سماں پیدا

حق نے شاعر کے تخیل کو وہ قدرت بخشی

زرّہٴ خاک سے کردے چمنِ تاراں پیدا

خواتین ہند

حق نے بھٹا ہے عجب جو ہر اثاران کو خود پرستی ہے نہ شہرت سے سروکاران کو
چشم خورشید نے دیکھا نہیں بے کاران کو کو کسبِ سج نے پایا ہے تو بیداران کو
خوابِ غفلت سے تعلق نہیں زہاران کو دی ہے اللہ نے وہ فطرت ہشیاران کو
حسنِ دولت نہ کریں مائل پنداران کو عارِ نحوست ہے خدمت سے نہیں عاران کو
جاں فدا آن پہ کرنا نہیں شواران کو آزمایا ہے زمانے نے کئی باران کو

شمعیں ظاہر میں ہیں باطن میں یہ پروئے ہیں
ان کی جرات کے جو قائل نہیں دیوانے ہیں

آفتاب

اے شمعِ دل فروزِ شہستانِ کائنات تیری کرن کرن ہرِ گِ جانِ کائنات
تو مرکزِ ثبات ہے دورِ حیات کا ہے تجھ سے اہتمامِ دورِ روزہ ثبات کا
سرِ شبِ زندگی کا ہے دریا ہے نور کا مقصدِ بہت وسیع ہے تیرے طور کا
ہنگامہ زندگی کا ترے دم سے گرم ہے یہ بزمِ تیری تابشِ بہیم سے گرم ہے

تو رہو یقا کے بے شمعِ راہ سے

تیرا وجودِ حسنِ ازل پر گواہ ہے

رباعی

محرّم جہاں لے کے قضا جائے گی واں شاعری واعر ی نہ کام آئے گی
پیری ہے فکرِ عاقبت کرنا داں کیا فکرِ سخن نبات دلوائے گی؟

دل خوش نہ ہوا، لال پیوستہ رہا بد حال رہا، خراب اور خستہ رہا
بے سود ہوئیں ادھر ادھر کی باتیں سربستہ جو راز تھا وہ سربستہ رہا

ہے شعر و سخن کو فکرِ رنگیں درکار یہ پھول کھلاتی ہے جوانی کی بہار
داماں خزاں میں گلِ خوش رنگ کہاں پیری میں نہ رکھا امیدِ رنگیں اشعار

انجامِ حیات اب نظر آتا ہے معلوم نہیں بُرا ہے یا اچھا ہے
کی عمر تمام شاعری میں ہم نے باتوں باتوں میں یہ سفر کاٹا ہے

اندزائن، ملا

۱۳ جنوری ۱۹۴۱ء



ملا اکبر علی

’فطرتِ آزاد‘

مکمل ہے ناک میرا خود ناک سر بسر ہوں ۔ دامنِ حیات میں آں مرغِ شکستہ پر ہوں

پالا ہے کجگوئیں تاروں پھر کُلف نے ۔ کس تیرے ناکوں میں آں جلوہ سحر ہوں

بہنِ محنت ناک کینِ فردوس در تلو ہوں

-

اے ام صحر! مانعہ پی شنائے فطرت ہے ۔ دری اور تیری کجائی میں چہاں رستِ قدرت ہے

جہاں جادواں روزوں کو مٹا اب نہیں ہے ۔ اگر تیرے تو دس میں ہے کس کی بدولت ہے

آتشِ بزمِ مٹلا ۔

۱۳ دسمبر ۱۹۶۷ء

اند نرائن ملا

سرگزشت

اند نرائن ملا، ابن پنڈت جگت نرائن ملا، ابن کالی سہائے ملا، ابن سیتارام ملا، ۱۹۱۰ء میں محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان کشمیری ہے، مگر ان کے مورث اعلیٰ سیتا رام ملا نے کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں سے اس خاندان نے لکھنؤ کا رخ کیا، اور اب یہی وطن ہے۔

اند نرائن ملا نے دس سال کی عمر میں گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں (اب گورنمنٹ جوبلی انٹر میڈیٹ کالج ہے) تعلیم شروع کی۔ ۱۹۱۴ء میں انٹرنس، ۱۹۱۹ء میں ایف، اے، ۱۹۲۱ء میں بی، اے ۱۹۲۳ء میں ایم، اے، اور ۱۹۲۵ء میں ال، ال، بی پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آئی، سی، ایس، کے امتحان میں بھی شرکت کی تھی، مگر انتخاب میں نہ آ سکے۔

انگریزی تعلیم کے دور میں اردو فارسی کی تعلیم گھر پر مولوی محمد برکت اللہ صاحب فرنگی محل سے ہوتی رہی۔ ان کو شعر و شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ اکثر پڑھاتے پڑھاتے شعر کہنے میں مصروف ہو جاتے تھے

اور ۵۰، ۶۰ شعر سے کم نہیں کہتے تھے۔

اس زمانے میں جناب ملا کو شعر و سخن سے اس قدر متفرق تھا کہ استاد کے شعرا صرار کے باوجود پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن کالج کے اندر انگریزی میں کچھ کچھ نظم کرنے کی عادت ہو گئی۔ چنانچہ میراثیں کی چند رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو کالج میگزین میں طبع ہوا اور نظر پسندیدگی دکھایا گیا۔

۱۹۲۴ء میں صحت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ بہتر یہ لیٹا رہنا بہتر ہے۔ پڑے پڑے دل گھبرا جاتا تھا، اس لیے کتابیں دیکھا کرتے۔ اس زمانے میں علامہ اقبال کا ایک مجموعہ ”پیام مشرق“ طبع ہوا تھا۔ اس کی نظم ”لآئہ طور“ کا انگریزی ترجمہ لیٹے لیٹے کر ڈالا، جو حلقہ احباب میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

اپنے استاد پنڈت منوہر زتشی ہیڈ ماسٹر جوبلی اسکول کے اصرار پر پہلی نظم بعنوان ”پرستارِ حسن“ ۱۹۲۴ء میں لکھی جو ”زمانہ“ میں ایک ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کا اصرار اور بڑھ گیا اور ملا مستقل نظم کہنے لگے۔ بہار مرحوم کے کہنے پر انجمن ”معین الادب“ کے ممبر بھی بن گئے۔

ملا سفید رنگ، موزوں قد، فراخ چشم، خوش وضع، اور مستین و مہذب انسان ہیں، کلام پڑھنے کا طریقہ مناسب ہے۔

شعر و سخن میں کسی سے ”نہذ نہیں“ اور نہ اس کو مناسب سمجھتے ہیں ردیف و قافیہ سامنے رکھ کر اشعار کم کہتے ہیں۔ چنانچہ طرح کی غزلیں بہت کم ہوتی ہیں۔

۹۔ فروری ۱۹۲۳ء کو شادی ہوئی اور اسی سال سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی، وکالت ان کا حنائی پیشہ ہے۔ حافظہ خداداد ہے۔ شعر ارادۂ نہیں کہتے بلکہ چلتے پھرتے کہا کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک شاعری کا ایک پہلو خلوص و صداقت ہے۔ اور ”خلوص و صداقت اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ شاعر اُن باتوں کا ذکر کرے جو اُس کی زندگی سے قریب تر ہوں اور جن کا اُس نے خود احساس کیا ہو، اور یہ ایسے شخص کی انفرادی فطرت پر منحصر ہے کہ اُس کے ذاتی تجربات اور احساسات، اقتصادی معاملات، معاشی حالات، یا روحانی کیفیات میں سے کس سے وابستہ ہیں۔“
اُردو زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کے شمول کے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

”اُس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ جہاں تک زبان قبول کرے۔ اب رہا اندازے کا سوال کہ زبان قبول کرتی ہے یا نہیں، تو یہ ایک فرد کے لیے مشکل ہے۔ لیکن وہ الفاظ جو عام فہم ہیں، اگر اُن کے مترادف الفاظ پیشتر سے زبان میں موجود ہیں، تو بھی ان کے استعمال کو ناپسند نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح زبان کی وسعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ مترادف الفاظ کے مفہوم میں بہت زیادہ اختلاف ہوتے ہیں اور جتنے زیادہ ہم معنی الفاظ ایک زبان میں شامل ہو جائیں گے، اتنا ہی اُن نازک اختلافات کو ادا کرنے کے لیے الفاظ کا فرق بڑھتا چلا جائے گا۔ اور یہ دیکھنے والے کی قابلیت پر ہوگا کہ وہ کون لفظ انتخاب کرتا ہے کہ وہی لفظ اُس کے مفہوم کی صحیح ترجمانی کر سکے گا۔“

رہا اُردو زبان کی خدمت کا سوال تو اس طرف ساری توجہ
مبذول ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر زبان وسیع ہوتی ہے تو اُردو کی
ترقی ہوتی ہے اور ایسا ہونا جب ہی ممکن ہے کہ عوام کی زبان بننے
کی صلاحیت دیکھا سکے۔

جو کوشش اُردو پھیلانے کی اور اُردو کا پیام عوام تک پہنچانے کی
جائے گی وہی اُردو ادب کے بقا کی ضامن ہوگی۔
ردیف و قافیہ کی ضرورت کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ
”قافیہ اور ردیف سے ایک آہنگ ضرور پیدا ہو جاتا ہے،
جس سے تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ شاعر کی قابلیت پر منحصر ہے
کہ اس آہنگ سے مدد لیے بغیر اپنے پیام میں اتنی تاثیر اور دلکشی
پیدا کر دے کہ سننے والوں کو اس آہنگ کی غیر موجودگی محسوس نہ ہو۔
اور زبانوں میں قافیہ و ردیف کی اتنی سختی نہیں ہے جتنی کہ اُردو
میں۔ اور پڑھنے والوں کو اس کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ غالباً
آہنگ کو ضروری سمجھنا کسی قدر ہماری عادت کا بھی نتیجہ ہے، کیوں کہ
ہم ہمیشہ با قافیہ اور باردیف نظمیں پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں۔“
دیگر اساتذہ کے چند پسندیدہ اشعار یہ ہیں:-

اقبال اچھا ہے ساتھ دل کے رہے پاسِ عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی جھوڑ دے

جوش ذرا آہستہ ہے پس کاروانِ جوشِ مستی کو

کہ سطحِ ذہنِ انسانِ کمال نہ ہوا ہے ساقی

جگر یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

یگانہ

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گا

آسی

صبح تک وہ بھی نہ جھوڑی تو نے اے بادِ صبا

یادگارِ رونقِ محفلِ تھی پروانے کی خاک

جنابِ ملا نظم میں اقبال، اور جوش کو اور غزل میں غالب، قانی

اور جگر کو استاد مانتے ہیں۔

انتخابِ کلام

گزری حیات وہ نہ ہوے مہرباں کبھی سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں را لگاں کبھی
 اتنا تو یاد سا ہے کہ ہم تھے جواں کبھی پھرتی ہیں کچھ نگاہ میں پر چھایاں کبھی
 دو گلِ نفس ہیں لکھ کے نہ صبا دے فریب دکھایا ہی ہم نے جیسے نہیں آشیاں کبھی
 بھولے ہوئے ہو تم تو دلائیں گے ہم نہ یا ہم تم بھی راؤ ز سیت میں تمہیں مہناں کبھی
 ویرانیِ نگاہ پر میسری نہ جائے پلتی تھیں اسکے سایے میں بھی کلیاں کبھی
 ہاں یاد ہو کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دکھاؤں کبھی

ملا بنا دیا ہے اسے بھی محاذِ جنگ

اک صلح کا پیام تھی اُردو زباں کبھی

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سو بام آیا تو کیا چشمِ موٹی لیکے عشقِ تشنہ کام آیا تو کیا
 کر دیا اک بار اس کا پیکرِ خاکی تو سرخ خونِ دل گر خنجرِ قاتل کے کام آیا تو کیا
 مدعاے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ میرے ہونٹوں تک الِ ناتمام آیا تو کیا
 گر چکی اک بار جب بلی نگاہِ شوق پر طور کی چوٹی سے پھر کوئی پیام آیا تو کیا
 ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ بندہ نو اسے بُراں کا پتہ ہاتھوں میں جام آیا تو کیا
 پُرسے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی اس میں بھولے سے اگر دل کا بھی نام آیا تو کیا
 خونِ لُضائع نہ ہو مجھ کو بس اتنی فکر ہے اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

ہیں ابھی خاکِ سترِ ملا میں کچھ چنگا ریاں

شعلہٴ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

مری بات کا جو یقین نہیں، مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
 تجھے دل تو کپکپائیں دے چکا، اسے غم نیا کے بھی دیکھ لے
 یہ تو ٹھیک ہے کہ تری بقا بھی ہے اک عطارے واسطے

مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے
 مراد لالگ ہے جیسا سا کچھ ترے حسن پر بھی چمک نہیں
 کبھی ایک مرکزِ زیست پر انھیں ساتھ لاکے بھی دیکھ لے
 نہ مٹے گا نقشِ وفا کبھی نہ مٹے گا ہاں نہ مٹے گا یہ

کسی اور کی تو مجال کیا اسے خود مٹا کے بھی دیکھ لے
 میں گلِ افسردہ باغ ہوں مرے لبِ مہنی کو بھلا چکے
 تجھے اے صبا جو نہ ہو یقین مجھے گدگد کے بھی دیکھ لے

یہ جہاں ہے اسے کیا پڑی ہو جو یہ سنے تری داستان
 تجھے بھی ہے ملا اگر یہ ضدِ غم دل سنا کے بھی دیکھ لے

ہر اک خوابِ تمنا نقشِ باطل ہوتا جاتا،
 یہ ربطِ عشقِ خود اک قدِ قائل ہوتا جاتا
 خبر لے حسنِ بے پروا کہ جرأت بن چلی ارا
 نظر آنے لگا ہے شیخ کو ہر جا وہی جلوہ
 نہیں لاتا ہر طرفِ حسنِ تابِ عاشقی شاید
 ہر اک انس و جان کو خوشبو ہر کٹالے میں انعمہ
 وہ چپ ہوا میں بھی چپ گردِ دنیا کو کیا ہے
 تراراں ہی اب راں کا حاصل ہوتا جاتا
 جو پردہ اٹھتا جاتا ہر وہ حامل ہوتا جاتا
 نظر کی آٹھ لیکر سامنے دل ہوتا جاتا
 یہ اب فرکے جانے کے قابل ہوتا جاتا
 جسے جتنا ہی چاہو اور قاتل ہوتا جاتا
 یہ مجھ سے چھپے مجھ میں کون شامل ہوتا جاتا
 ہمارا تذکرہ مخمل بہ مخمل ہوتا جاتا

کسی سے عرض دل کرنا جو اک دنیا کو آسان
نہ جانے یہ بھی کیوں ملتا کو مشکل ہوتا جاتا

جھکنا ظہارِ رماں کی بہ سانی نہیں جاتی خود اپنے شوق کی دل ریشمانی نہیں جاتی
ٹریپ شیشر کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیر کی محبت کی نظر جلد ہی سوچا جاتی نہیں جاتی
افق پر نور سجھاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی کہ مجھ کو دل بھی نظروں کی دستانی نہیں جاتی
سکول آکے وہ چشمِ کرم بھی کیا بلے گی شعلہ نہر سے سحر کی دیرانی نہیں جاتی
کسی کے لطفِ بے پایاں نے یوں سکول دکھا کہ ابنا کردہ جزوں کی پشیمانی نہیں جاتی
یہ بزمِ دیرو کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ ذرا آواز گونجی اور پھپھانی نہیں جاتی
نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو قیامت تک پھر اس دلی پشیمانی نہیں جاتی
نظر جھوٹی شباب اندھا ہو وہ انقشِ فانی پر حقیقت ہو تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی
نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے نظر اب ستارہ دشمن کی سچائی نہیں جاتی
نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پرین نہیں نام کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی

صدائے جنگ ہر جانب سے آتی ہے مگر مٹا

تری اب تک وہ خوابِ درغزل خوانی نہیں جاتی

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوش اضطراب آرزوئیں ہیں آئے گا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈ ہی لگی نگاہِ استخا زیستِ بزمیت دل ہر دل اور سنا پھر شباب

عمر وفا ہے ایک خواب

تم مجھے بھول جاؤ گے

جسکی تجلیوں سے تھی محفلِ دوشِ حشر خیز جس کے تپسوں سے تھا سازِ حیاتِ غریز
جس کے نفسِ نفس سے تھی بزمِ امیدِ مشکِ بیز رکھ کے کہو جگر یہ ہاتھ آج بھی ہو ہی غریز
وقت ہے کچھ عجیب چسین

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہیم جہاں ہے انقلابِ دے رکنا نامِ کائنات دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں کبھی جاتا
آرزوئیں کی دل میں ہر ایک سچی ہوئی برا ایک نگاہ ایک منگایا منگایا ایک راتا
بستیِ عشق بے ثبات

تم مجھے بھول جاؤ گے

کوئی کسی کی یاد میں حشر تک جیا نہیں تیری نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی بچا نہیں
بن کے کھرنڈ کو نسا داغِ جگر اڑا نہیں سنگِ بحد کو توڑ کر سنبہ کہاں اُگا نہیں
عزم کوئی لا دو نہیں

تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگارِ زمانہ شوق کو تم سجاؤ گے پھر کسی بت کی واسطے فرشِ نظر بچھاؤ گے
آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے نام مرا اگر کوئی لے گا تو مسکراؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
 تم مجھے بھول جاؤ گے
 ”تھم“

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
 جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم
 تمہیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
 تمہیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
 تمہیں کورپ کی گہرائیوں میں دیکھا ہے
 جدھر بھی آنکھ اٹھی ہے فروغِ بام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
 جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم
 ہر اک امید کا میری تمہیں ہو گوارہ
 تمہیں ہو جیسے ہر اک درد کا مرے چارہ
 تمہیں ہے آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ
 ہر ابتداءے تمنا کا اختتام ہو تم
 سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
 جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم

میں کون، اک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد
 تم ایک بزم کی زینت تم اک چین کی مراد
 کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد
 مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم
 سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مرا جزو لب وہ نام ہو تم
 آنق حیات کا پھر بھی تمہیں سے ہی زریں
 ہر ایک خوابِ تصویری تمہیں سے ہی رنگین

تمہاری سمت ہر دل کی نگاہ باز ہیں اندھیری رست کی اک زرنگار شام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مراجز و لب وہ نام ہو تم

کروں میں عرضِ تنامری محال نہیں سوالِ دل میں ہوا ویرا ستِ انہیں

تمہاری یاد سے غافل مگر خیال نہیں میں کچھ کہوں نہ کہوں حاصلِ کلام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مراجز و لب وہ نام ہو تم

خمشوئیوں میں ہر دمساز کون تم جو نہیں نظرِ کامری راز کون تم جو نہیں

نفسِ نفس کی ہر آواز کون تم جو نہیں پیا مبر ہوں اگر میں مرا پیام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مراجز و لب وہ نام ہو تم

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آجکے جھکا

تھکے در پڑ ہی آج ہی جبینِ فرسا تو کیا جان کا کٹا سے انتقام ہو تم

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

جو بن گیا ہے مراجز و لب وہ نام ہو تم

نوح ناروی

۲۳ دسمبر ۱۹۳۱ء



نوح نازوی

شبنم کے ہر آنسو میں بات نہ الی ہو تی ہے نرشی جین پر قطرہ ہے برگِ شجر پر پڑتی ہے
 کہنچ کر بزمِ مہاں میں چند نالے چل دیئے رہنے والے رہ گئے چل دینے والے چل دیئے
 چارچلے ایسے دیکھنے والے دلِ بخیر کے کتنے قطرے فون کے ہیں کتنے کمرے تیرے
 خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے
 بچھ اٹھاتے ہیں یوں پار ساز مالے کے رک جیسے ہوں وہی مالکِ شراب خالے کے
 پوچھتے ہو کیا حقیقت عاشقِ دلگیر کی حیرت آئینے کی دیکھو خاموشی لغویر کی
 کمرِ سخت کبھی جی سے گزرنے نہیں دیتی خطبے کی سنا بچھ سربے نہیں دیتی
 ہم دیرِ حرم دیکھ چکے کون دسکاں کچھ بس ایک ہی اللہ یہاں سہی دلاں کچھ
 میرے چکرِ دہل میں ہے دجھڑیا یاکی ارمانِ کلا انگارا اسید کی چنگا رسی
 ملا دی ایسے ہوس میں ساری آبر دیر کی کھل جا اب میرے دل سے نہ میں تیرا نہ تیرا
 اس طرح دادِ حسن دی میں نے دیکھ کر اُن کو آہ کی میں نے
 سانی جو دل سے چاہے تو آئے وہ زمانہ ہر شخص ہوشیار الی ہر گھر شراب خانہ
 فتنے دالے دبا گئے تھے جتنے پڑے ہوئے بیٹھے کہیں جو سم تو وہ سب اٹھ اٹھے ہوئے
 بکھالنے والے بکھالیں شوق سے اتر ہم کو تم کو آنا جانا ملنا جانا کھل کر چھپ کر ہم کو تم کو
 مقامِ رام پور سہر کوہِ نور فوجِ نادر کی فوجِ نادر کی

نوح ناروی

سرگزشت

محمد نوح نام، نوح تخلص، وطن نارہ ضلع الہ آباد، تاریخ ولادت یکم
شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ دسمبر ۱۸۷۹ء، اور مقام ولادت بیوانی پرتھوی
سلون ضلع رائے بریلی ہے۔

اُردو کی ابتدائی تعلیم حافظ قدرت علی، مولوی یوسف علی ناروی
اور حاجی عبد الرحمن جالسی سے اور عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم میر
نجف علی سے حاصل کی۔

شوقِ شعر گوئی بھی اسی دوران میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں میر موشو
سے اصلاح لی، پھر امیر مینائی سے اور چند غزلوں میں جلال گھنوی
سے مشورہ کیا، اور آخر میں حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔
ابھی اصلاح لیتے ہوئے دو برس بھی نہ ہوئے تھے کہ استاد کے شوق
قدوسی نے گدگدایا اور اپنے عزیزوں سے چھپ کر حیدرآباد دکن
پہنچے۔ ان کو دیکھ کر حضرت داغ نے فرمایا کہ تمہارا کلام دیکھ کر ہم تو
یہ سمجھتے تھے کہ نوح، حضرت نوح کے ہم عمر ہوں گے مگر تم تو بہت
کم عمر ہو۔ کچھ عرصے کے بعد اپنے وطن واپس چلے آئے۔ ایک بار

استاد موصوف نے خود بھی بلایا تھا۔

نوح کا درمیانی قد، گول چہرہ، اور گندی رنگ ہے، تندرستی بھی اچھی رہتی ہے۔ معقول زمینداری کے مالک ہیں۔ اس لیے شہاء روز شعر و شاعری اور اصلاح سخن میں مشغول رہتے ہیں۔ گفتگو میں ظرافت پائی جاتی ہے۔ طرزِ غزل خوانی بھی خوش آئند ہے۔ سافلہ بہت اچھا ہے، حضرت داغ کا بہت سا کلام اور لطیفہ ان پر ہیں کوئی جلد اور فقرہ لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ تنقید بہت ہونے لگتی ہے۔ انگریزی لباس سے پرہیز کرتے ہیں، اور صوم و مسلوٰۃ کے پابند ہیں، مگر کبوتر بازی کا شوق بہت ہے۔

حضرت داغ کے جانشین شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری انہوں نے آخر عاشقانہ ہے اور اسی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ہندی اور سنسکرت کے گراں الفاظ استعمال نہیں کرتے، جب وسعتِ زبان کے لیے نئے جملے، جدید فقرے، اور خوبصورت الفاظ استعمال مستحسن تصور کرتے ہیں۔

رولیف و قافیہ کی پابندی سے اشعار کہتے ہیں۔ لیکن شعر کے لیے رولیف سے زیادہ قافیہ کو ضروری جانتے ہیں۔ غزل میں داغ، اور نظم میں اکبر الہ آبادی اور جلی کو مستند مانتے ہیں۔

ان کے چند پسندیدہ اشعار حسب ذیل ہیں۔
 داغ
 سب لوگ جدھر تم ہو جدھر دیکھ رہا ہوں
 ہم دیکھنے والوں کی زندگی کدھر رہ رہی ہے

وارغ جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
 مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
 ذوق جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدہ نم اُٹھے ہیں
 آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اُٹھے ہیں
 غالب کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجے
 ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
 اکبر مایوس ہوں باغِ عالم میں امید سے یاری چھوٹ گئی
 جس پٹر کو سینچا سوکھ گیا، جس تلخ کو باندھا ٹوٹ گئی
 // وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
 اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
 دو دیوان سقینہ نوح اور لوقان نوح طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکے
 ہیں۔ تیسرا دیوان اعجازِ نوح ابھی نہیں چھپا ہے۔

انتخابِ کلام

شکرِ یہ میرزاں زباں پر آئے فرماتے ہوئے یہ سب سخن در آئے
طوفانِ کشش کا آج ایسا اٹھا چل کر نہیں آئے توجہ بکرائے

فصیح الملک کی تقلید کرنے کو ضرور آئے انہیں کی پیری میں چلتے پھرتے اتنی دور آئے
غرض اے لوح اس تہیہ اپنا یہ طلب ہے جنابِ باغ بھی آئے تھوڑے ہم بھی رام پور آئے

لڑوؤں کا نپا، نظرائی زمیں، چین ان بن آئی مشکل سے
وہ آہ قیامت تھی شاید، نکلی جو مرے ٹوٹے دل سے
تم دل میں چھو کر تیرا نپا، کیوں کھینچتے ہو میرے دل سے
دو بچھڑے ملے اک مدت کے اب ساتھ چھٹے کا مشکل سے
آواہِ محبت سہل نہیں، آئیں گی یہ باتیں مشکل سے
بہتر ہے کہ تم تبدیل کرو اپنے دل کو میرے دل سے
اس طلب تھا یہی جاتے ہو کہاں، بہلو گے کہیں تم مشکل سے
جنت نے ہمیں آوازیں دیں، بکھے جو ہم انکی محفل سے
جم کر جو رہے تو خاک رہے، رہنے کا نتیجہ خاک نہ تھا
خوبی ہے یہی ارمانوں کی آہیں دل میں نکلیں دل سے

یہ سوچ سمجھ لو تم پہلے پھر اپنی نظر کو گردش دو
پیوستِ رگِ جاں میں جو ہوا نکلا ہے وہ ناوکِ مشکل سے

دریاے محبت میں تظاہرِ موجوں کی ہمدی نہ ہوئی
جب ڈوب رہی تھی کشتیِ دل، کچھ خاکِ ٹری تھی ساحل سے
مشتاقِ شہادت کا ارماں موقوف تھا اتنے جھگڑوں پر

گردن نے ملایا خنجر سے، خنجر نے ملایا قاتل سے
محبورِ غمِ الفت نے کیا، حسرت نے کیا، قسمت نے کیا
اب اس کو نہ پوچھے مجھ سے کوئی دیتا ہوں نہیں دل کس دل

دنیا میں مجھے راحت نہ ملی، ممکن ہے عدم میں مل جائے
جاتا ہوں اُسی منزل کی طرف آبا تھا میں جس منزل سے

جلووں کا سماں تھا ایک طرف آہوں کا دھواں تھا ایک طرف
مجنوں نے یہ دیکھا محمل میں، لیلانے یہ دیکھا محل سے

ہم کیوں کہیں ہم کو کیا مطلبِ رودادِ مصائب وہ چھپیں
اُجڑے گھر کی، ٹوٹے دل کی، اُجڑے گھر سے ٹوٹے دل سے

اک درِ جگر کی دو شکلیں دل دینے پہ معلوم ہوئیں
پڑھتا ہے بہت آسانی سے گھٹا ہے نہایت مشکل سے

سو فتنے اُٹھے سو حشر اُٹھے اُٹھنے کے لیے کیا کچھ نہ اُٹھا
اب ہم کو یہ سنا باقی ہے اُٹھ جاؤ ہماری محفل سے

اے نوح مری کشتی کو ذرا بچنے کا طریقہ سمجھا دو

طوفان اٹھا کر دریا میں جاتے ہو کہاں تم ساحل ہے

دل ہماری طرف سے صاف کرو جو ہوا سو ہوا معاف کرو

مجھ سے کشتی ہے اُس کی شانِ کیم تم گناہوں کا اعتراف کرو

حُسن اُن کو یہ رائے دیتا ہے کام اُمید کے خلاف کرو

حضرت دل بھی ہر دیر و حرم خاں یار کا طواف کرو

طورِ سینا کی سمت جائیں کلیم

نوح تم سیرِ کوہِ قاف کرو

میرے بچنے کا طور کچھ بھی نہیں سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں

دل لگا کر پھنسنے ہم آفت میں بات اتنی ہے اور کچھ بھی نہیں

آپ ہیں آپ آپ سب کچھ ہیں اور میں اور اور کچھ بھی نہیں

ہم اگر ہیں تو جھیل ڈالیں گے دل اگر ہے تو جو ر کچھ بھی نہیں

شعر لکھتے ہیں شعر پڑھتے ہیں

نوح میں وصف اور کچھ بھی نہیں

یہ مطلب ہے کہ مضطر ہی رہوں میں بزمِ قاتل میں

تڑپتا ٹوٹا دھنسل ہوا، آدابِ محفل میں

اثر کچھ آپ نے دیکھا ہمارے جذبِ کمال کا

اُدھر جھوٹے کمالاں سر اُٹھائے تھے وہاں

اکسی کس سے پوچھیں حال ہم گورِ غریباں کا
 کہ سارے اہل محفل چپ ہیں اس خاموش محفل میں
 ادھر آکر ذرا آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے

وہ لٹکا تو بتا دے جس سے دل ہم ڈال دینا
 بدل دے اس طرح اسے چرخِ حسن و عشق کا منظر

پس محل ہو یلیا تیس ہو یلیا کے محل میں
 بندھے شرط و فاکیوں کر نیچے رسم و فاکیوں کر
 یہاں کچھ اور ہے دل میں وہاں کچھ اور ہو لیں
 ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر

قیامت ڈھا گیا زانو پہ لٹا اُن کا محفل میں
 یہ کیا اندھیر ہے، کیسا غضب ہے، کیا تماشا ہے

مٹاؤ بھی اُسی دل کو رہو بھی تم اُسی دل میں
 تماشا ہم بھی دیکھیں ڈوب کر بحرِ محبت کا

اپنا بیج کی طرح بیٹھے ہیں کیا آغوشِ ساحل میں
 طریقہ اس سے آساں اور کیا ہے گھر بنانے کا

مرے آغوش میں آکر جگہ کر لیجیے دل میں
 بڑھا اے نوح جب طوفانِ دریا سے حوادث کا
 تو غوطے در طغمنے دیدیے افکارِ ساحل میں

تاب نہیں ہکوں نہیں دل نہیں اب جگر نہیں
 اپنی نظر کدھر اٹھے کوئی ادھر ادھر نہیں
 روز شب اٹھتے بیٹھتے اُن کی زبان پر نہیں
 کوئی نہیں کی حد نہیں شام نہیں سحر نہیں
 کوئی یہاں سے چل دیا رونقِ بامِ دوشیں
 دیکھ رہا ہوں گھر کو میں گھر بے گردہ گھر نہیں
 اتنی خبر تو بے ضرور لے گئے دل وہ چھین کر
 کیا ہوا اُس کا پھر آل اس کی بھے خبر نہیں
 کیوں وہ ادھر ادھر پھرے کیوں یہ حدود ہیں بے
 تیری نظر تو ہے نظر میری نظر نظر نہیں
 مجھ سے بگڑ کر اپنے گھر جائے خیر جائے
 آپ نے یہ سمجھ لیا آہ میں کچھ اثر نہیں
 دیر کو ہم گھٹائیں کیوں کعبہ کو ہم بڑھائیں کیوں
 کیا ہے خدا کا گھر یہی کیا وہ خدا کا گھر نہیں
 پردے سے باہر آئیے رخ سے نقاب اٹھائیے
 تابِ جال لاسکے اتنی مری نظر نہیں
 مجھ کو خیالِ روز و شب خاک رہے مزار میں
 ایسی جگہ ہوں جس جگہ شام نہیں سحر نہیں

تیغ کو، سناں کو، قہر کو، ہلا کو

اہلِ نظر کی رائے میں اُن کی نظر، نظر نہیں
ڈر گئے اہلِ انجن تیر جو آپ کا چلا

اس نے کہا اِدھر نہیں اُس نے کہا اُدھر نہیں
روز کے غم نے اس طرح خوگر ضبطِ غم کیا

درد ہمارے دل میں ہے شکوہ زبان پر نہیں
پوچھتے ہیں وہ حالِ دل طولِ سخن سے فائدہ

سو کی یہ ایک بات ہے کہہ دوں مجھے خبر نہیں
اُن میں کچھ اور بات تھی اُن میں کچھ اور بات ہے
حضرتِ نوح کا گماں حضرتِ نوح پر نہیں

نارسا آہیں مری اوجِ مراتب پا گئیں
دل سے نکلیں لبِ تکائیں آسماں پر چھپ گئیں
نزع میں دل سے نکل کر جو زباں پر آ گئیں

وہ صدائیں کچھ نہ تھیں لیکن قیامت ڈھائی
اے نگاہِ دلنواز اٹھ اور میرے دل کو دیکھ
جتنی نکلی تھیں تمنائیں پھر اتنی چھپ گئیں
میں امیدِ غنچہ و گل اب کروں تو کیا کروں

کونہیں چھوٹی تھیں جن شاخوں میں وہ مرتعہ گئیں

خانہ دل میں یہ عالم آرزوؤں کا رہا
 چند نکلیں چند ٹھہریں کچھ گئیں کچھ آئیں
 سب نے جانا ایک اپنا ہم وطن کم ہو گیا
 غم اگر نکلا تو دل کی حسرتیں گھب گئیں
 صورت سیلاب مضمون کا اثر بڑھتا گیا
 نوح طوفانی کی غزلیں خوب شہرت پائیں

وحشت کلکتوی



غزل

تری بزمِ ناز میں تھا جو دل کبھی شمعِ روشنِ آرزو
 ستمِ زمانہ سے ہنگیا وہی آج مدفنِ آرزو
 مرا دل ازل کا فسرہ ہے مجھے شوق سے سرد کار کیا
 نہ ہوا اے میکدہٴ ہوس نہ دماغِ گلشنِ آرزو
 گئی یک بیک مری خشکی ہوئی دور ساری شکستگی
 کبھی آئی مجھ کو لے سوئے دل جو نسیمِ گلشنِ آرزو
 نہ خدنگِ ناز نے رُخ کیا کبھی جانبِ دلِ بے نوا
 نہ گلِ مراد سے پُرا ہوا کبھی اسپادامنِ آرزو
 مجھے یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہارِ جس سے تھی منفصل
 وہ نہالِ تازہٴ رنگِ دلو وہ چراغِ روشنِ آرزو
 نہ کوئی ہو سکتا ہے نہ ولولہ یہ ہے حالِ دشتِ خستہ کا
 ہے فریبِ خوردہٴ آرزو وہ بیا ہے دشمنِ آرزو

وحشت کلکتوی

سرگزشت

رضا علی نام، وحشت تخلص، ۱۸ نومبر ۱۸۹۱ء تاریخ پیدائش، اورٹون کلکتہ ہے۔

اُردو فارسی کی تعلیم کے بعد انگریزی سے واقفیت حاصل کی۔
موزونیت طبع خدا داد تھی، سولہ سال کی عمر سے طبیعت کو شعرو سخن
سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ مولوی ابوالقاسم محمد شمس، خلیفہ مولوی عبدالغفور
خان بہادر نساخ سے تلمذ ہو، جو حضرت داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔
مشق سخن ملازمت کے دوران میں بدستور جاری رہی۔ ایک
دیوان ۱۹۱۰ء میں طبع ہو چکا ہے۔ اس پر مولانا حالی، علامہ شبلی اور
بناب ظہیر دہلوی نے داد اور مبارکباد دی تھی۔

تعلیم و تدریس اور شعرو سخن حیات کے مستقل مشاغل ہیں۔
۱۹۳۶ء تک گورنمنٹ اسلامیہ کالج کلکتہ میں پروفیسر رہے۔ فی الحال
پنشن پارے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں سرکار سے ”خان بہادر“ کا خطاب بھی مل چکا ہے۔
انھیں میرزا غالب کا رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔

انتخابِ کلام

لطفِ تنہا سے جب جب وہ مسکرا دیے ہیں
کچھ حرفِ کار نہ دیکھا کچھ یادِ عشقِ رفتہ
میں نے بھی خمِ دل کے اُن کو دکھا دیے ہیں
جتنے تھے نقشِ دل میں ہم نے مٹا دیے ہیں
اُس نے عنایتوں کے دریا بہا دیے ہیں
اُٹھتے تھے دلوں کے کچھ ہم نے دبا دیے ہیں
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دیے ہیں
کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دیے ہیں
تو نے تجلیوں کے پردے گرا دیے ہیں

کرتا ہوں وحشت اُن سے عرضِ نیازِ پناہ

اس کام کے طریقے دل نے بتا دیے ہیں

بار آئی ہر اب مجھ کو کل جانا ہو گلشن سے
ہمیں اے ہم نشین کج تنہائی میں رہنے سے
پہنچ جاتا ہوا اپنا ہاتھ خود اپنے گریباں تک
ستم ہے آشنا بیگانگی اے باغباں تیری
نشیں ہیں نہیں کیا اس کی صورتِ نظر آ
محبت ہے کہ ہر عاشق فری سطرِ سمجھوں
بجز خوںِ تن کا کیا نتیجہ ہے تنہا کا
تفس میں ہوں مگر اس عیون کی نہیں جانتی

نگاہِ باغباں ہنسی نہیں میرے نشین سے
سلاجِ افسردہ بیگانہ ہو گا سیرِ گلشن سے
وہ ہم کو دیکھ کر جب ہنسی چھپا لیتے ہیں اس سے
ہوا خواہاں گلشن ہی نکالے جائیں گلشن سے
دکھائی دے رہا ہو جس بس شاخِ نشیں سے
مجھے تو دوسری گستاہی برابر اُن کی چٹوں کے
بغیر از برقِ خرمن اور کیا حال ہو خرمن کا
خیالِ تباہی گلشن کا، پیام آتے ہیں گلشن سے

بڑھا کر شوقِ نظارہ بڑھائی حسن کی پیش
 لگائے چار چاند اُس نے رخِ روشن کو چہنچہ
 ترے غم نے لڑا دینگے مسلمان کو مسلمان
 ترے عشوے بھڑا دینگے برہمن کو برہمن
 ہوا ہے باعثِ تکلیف اب شغلِ سخن و حشمت
 تعلق قطع کرنا ہی پڑے گا مجھ کو اس فن سے

ہٹا نہ سائیہ گیسوے فتنہ زائے مجھے
 ترے تعاقبِ صیر آزما سے ڈرتا ہوں
 غم کام آئی کبھی اپنی کوششِ تدبیر
 مری نگہ نے حرفوں سے کھدیا سیرِ بزم
 ہزار شکر کہ جس حال میں میں غم میں ہوں
 نگاہیں پڑتی ہیں مجھ پر بھی بسے ترے حد
 بلائیں گھیر لیں آکر تری بلا سے مجھے
 دگر نہ عہد و فاپے تری جفا سے مجھے
 کوئی مراد ملی تو ملی دُعا سے مجھے
 کہ کوئی روک تو لے عرضِ دعا سے مجھے
 نہیں شکایتِ جو ربتاں خدا سے مجھے
 تری نگاہ نے کیا کر دیا ہے کیا سے مجھے

میں بزمِ یار میں محنتِ طاہر ہوں وحشت

نویہِ عیش ہے اُس چشمِ آشنا سے مجھے

وہ نگاہیں مہربانی پر جو مائل ہو گئیں
 میرے سوزِ دل سے ہوتی ہیں نہیں تحریرِ عشق
 جو تمنائیں کہ قاتل سے بھی تک نہیں نہاں
 اُن نگاہوں سے ہیں تھی آرزوئے التفات
 سچ تو یہ ہے اور بھی غارِ تگرِ دل گہنیں
 میری ہیں باعثِ گرمی محفلِ گہنیں
 کچھ نمایاں وہ شکلِ رقصِ بسل گہنیں
 ملتفت ہو کر وہ برقِ خرمینِ دل گہنیں
 اللہ اللہ کس طرح شمشیرِ قاتل گہنیں
 رفتہ رفتہ محوِ مثلِ حرفِ باطل گہنیں
 حسرتیں دل کی چراغِ تربتِ دل گہنیں
 اس کو کہتے ہیں فاداری کبھی چھوڑا نہ تھا

وہ نگاہوں سے مری بچتے ہیں ڈرتے ہیں یا اگر ہم سے کہیں مطلب کی سائل گئیں

تا بہ منزل جب رسائی ہو گئی وحشتِ محال

دقتیں ہر ہر قدم پر مجھ کو منزل گئیں

وہ محبت میں جز محبت مرا کوئی مدعا نہیں ہے

نظر خراستے ہو مجھ سے کیوں تم مری کوئی التجا نہیں ہے

ہوا میں زورِ شمشین نہیں ہے گلوں میں بوسے وفا نہیں ہے

سبھی میں بیگانہ اس چمن میں کوئی میاں آشنا نہیں ہے

طریقِ الفت میں اپنی منزل کدھر ہے اس کا پتا نہیں ہے

سوا سے گم کردہ راہِ دل کے کوئی مزارِ ہنہا نہیں ہے

نہ زحمتِ فکرِ چارہ سازی نہ بارِ احسانِ چارہ ساز

ملا ہے قسمت سے تجھ کو اسے دل وہ درد جس کی دوڑ نہیں

ادھر وہی ہو نیازِ ہندی ادھر وہی شیعہ تغافل

ہو سے میں بے نیازِ ایت کو جیسے میرا خدا نہیں ہے

حریفِ اندازِ بے نیازی بنا ہوں اس شوخِ ناز نہیں کا

زبان پر مدعا نہیں ہے نگاہ میں التجا نہیں ہے

وہی ہے برہم نیازِ مسداںِ عبا کی ہر دم جانفشانی

وہی ہے بازارِ دستاناں جہاں سارِ وفا نہیں ہے

کہاں سے ہو خواہشِ تکلم بجا ہے وحشتِ تری خوشی

کوئی تراجمِ نعر نہیں ہے کوئی تراجمِ نوا نہیں ہے

سینہ غم میں نہیں پروا نہ ہی قاتل میرا
تجیر ہے مرے ضبط پہ قاتل میرا
نہ اثر کو مرے پایا نہ غرض کو سمجھے
فقر و ریاسے تو ٹکلا ہوں مگر ڈرتا ہوں
زندگانی طمع خام میں گزری ساری
سخنی ماہ سے ہوتی نہیں دل کو امید
شمع بھی دیکھتی ہے منہ سر محفل میرا
کیا سبب ہے کہ تڑپتا نہیں بسمل میرا
طرز اڑاتے رہے گلشن میں نادل میرا
ڈوب جاتے نہ سفینہ لب ساحل میرا
فکر حاصل کے سوا کچھ نہیں حاصل میرا
کہ گزرنے ہو گا کبھی تا سیر منزل میرا

رات اُس نے جو نظر مجھ سے چرائی وحشت

مل گیا خاک میں امید بھرا دل میرا

اسی میں عافیت ہے، زندگی کو یوں بسر کرنا
نہیں منظور اپنے درد کی تجھ کو خبر کرنا
ادائے دلبری کے ساتھ اُنھیں لکھوں ہنسنے
اسے نیرنگ کہتے ہیں کہ اُس کا فر کو اتا ہے
کسی کو ظلم سے کرنا ہلاکِ شیوہ غفلت
نگاہ ناز سے دینا کسی کو درسِ مشاقتی
کبھی تو شوخیوں سے جرات آموز ہو جانا
اشا ایسے کبھی کھوئے ہوؤں کو ہوش ملانا
نہ فکر نفع میں رہنا نہ پروا سے ضرر کرنا
نہیں آتا نہ آئے میرے نالوں کو اثر کرنا
مگر آیانہ اپنے خستہ حالوں پر نظر کرنا
نئے انداز سے ایک ایک ادا کو جلوہ گر کرنا
کسی کو دل لگی سے زخمی تیر نظر کرنا
کسی کو بوسے زلفِ عنبریں سے بخیر کرنا
کبھی پھر شیوہ تنگیں سے محروم نظر کرنا
کبھی پھر ہوش والوں کو یکا یک بے خبر کرنا

کروں میں کاوشیں فکر سخن میں کس لیے وحشت

نہیں منظور بزمِ شعر میں عرضِ ہنس کرنا

یہ کیسی کثرتِ گل ہے یہ کیا رونق ہے گلشن کی
 جگہ کا ہے کو اب ہوگی یہاں میرے نشیمن کی
 تماشا ہو گئی سحر آفرینی چشمِ پُرفن کی
 ہوئی ہے ایک حالتِ بزم میں شیخ و برہمن کی
 گریباں کا مرے قصہ طلب ہے چاکِ ناکامی
 گلِ مقصود سے زینت ہوئی ہے کس کے دامن کی
 نہ میں بیگانہ گلشن، نہ گلشن مجھ سے بے گانہ
 خدا جانے ہوئی کیا وجہ بربادیِ نشیمن کی
 نہ ہر دستِ جنوں تو کون چرساں ہو گریباں کا
 نہ لے دشتِ خبر تو سخت رسوائی ہے دامن کی
 وہ حزن خود نما مستور ہو کر اور چپکا ہے
 بنی بے نور کی چادر یہ کیفیت ہے چلن کی
 نہ حسن اُن کا مقید ہے، نہ چشمِ شوق عاجز ہے
 پھر آخر کس لیے رکھی گئی ہے آرزِ چلن کی
 دلوں کا مدعا جب ایک ہے، تفریق پھر کیسی
 عبادتِ شیعہ کی جو ہے وہی پو جا پرہمن کی
 دکھائے ہیں غزل میں آج جو ہر کچھ طبیعت کے
 طلب کرتا ہوں اہل فن سے دشتِ اوم میں فن کی

اشاپ

میں

میں

میں

میں

میں

میں

میں

اشخاص

- ۱
- آتش: ۱۴۳، ۱۳۹، ۵۰
- آرزو: ۳۱۲
- آرزو کهنوی: ۱۸۸، ۲۸، ۴۴، ۳۴، ۱
- ۲۳۵، ۱۸۹
- آزاد انصاری: ۱۵، ۱۳، ۱۸، ۲۱۳
- آزاد دہلوی: ۲۸۲
- آسی چنپوری: ۳۲۵، ۳۱۱
- آل رضا، سید - رضا لکھنوی
- ایوالاثر - حفیظ جان دھری
- ابوالاحسان - آزاد انصاری
- ابوالقاسم محمد شمس
- اثر امپوری: ۲۵، ۲۴
- اثر مہبائی: ۳۵، ۳۷، ۳۸
- اثر لکھنوی: ۳۸، ۴۴، ۴۹، ۵۰
- اجود صیانا تہ شید پوری، پنڈت: ۲۸۲
- احسان الحق، احسان دانش: ۵۹، ۴۱، ۶۳
- احمد خاں لکھنوی، ڈاکٹر: ۱۵
- احمد حسین خان صاحب، خان بہادر نواب: ۱۸۷
- احمد دین پال، مولوی: ۸۹، ۳۷
- احمد شاہ درانی: ۱۷۱
- احمد علی محمد آبادی، مولوی: ۲۵۹
- احمد یار خاں: ۲۲۱
- اختر شیرانی: ۷۱، ۳۷، ۴۴، ۷۲
- ارشاد علی گورگانی، میرزا: ۲۳۳
- اسمعیل خاں شیرانی: ۷۳
- اصغر گوندوی: ۱۲۶، ۱۲۷، ۲۰۰
- اقبال: ۱۷، ۱۸، ۲۸، ۳۸، ۸۹، ۹۱
- ۱۲۷، ۱۵۱، ۴۴، ۲۲۲، ۲۲۷
- ۲۵۰، ۲۷۱، ۳۰۰، ۳۱۱، ۳۲۲
- ۳۲۵، ۳۲۴
- اکبر الہ آبادی: ۳۳۶، ۳۳۷
- الطاف احمد - آزاد انصاری
- الطاف حسین، خواجہ - حالی
- امام الفن - جلیل مانکپوری
- امر ناتھ - ساحر دہلوی
- امیر احمد خاں بہادر، نواب سید: ۹۹
- امیر اللہ، منشی - تسلیم لکھنوی
- امیر حسن، شمس العلماء مولوی: ۸۹
- امیر بیانی: ۱۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۲۷۰، ۳۳۵
- امین حرمین: ۳۸، ۸۷، ۸۹، ۹۰
- انثا: ۱۰۲، ۲۱۳
- انند زائن - ملا لکھنوی
- انوار حسین، سید - آرزو لکھنوی

افیس، میرزا: ۱۴۸، ۱۶۳، ۱۹۱، ۱۸۹، ۲۲۲

۳۲۲، ۲۶۱

اولاد حسین، مولوی — شادان بلگرامی

ب

بازر حسین، حکیم سید: ۲۵۹

بدرالدین احمد، سید — کاشف

برجوبن دتاتریہ، پنڈت — کیلی دہلوی

برکت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولوی محمد: ۳۲۱

بشیر احمد علی گڑھی، مولوی: ۱۵

بشیر احمد خاں، نواب: ۱۴۹

بہار: ۳۲۲

بیان یزدانی: ۳۱۱

بیجان: ۲۱۱

بخود دہلوی: ۱۰۱، ۵۵، ۵۰

بیدل: ۱۶

پ

پرشاد رام، پنڈت — رازدان

پیارے سوبن دتاتریہ، پنڈت: ۲۹۲

ت

تحنین علی امیری، مولوی: ۲۴۶

تسلیم لکھنوی: ۱۶۲، ۱۲۵

تلوک چند — محمود

ث

نماقب دہلوی: ۲۳۳

نماقب لکھنوی: ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴

ج

جانکی پرشاد، پنڈت — بیجان

جعفر علی خاں، میرزا — اثر لکھنوی

جگت رائے، پنڈت: ۳۲۱

جگر مراد آبادی: ۴۵، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶

۳۲۵، ۳۲۴، ۲۲۲

جگن ناتھ — آرزو

جلال لکھنوی: ۱۶۰، ۳، ۳۵، ۳۶، ۳۷

جلیل لکھنوی: ۲۴، ۲۹، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۸

جلیل القدر — جلیل مانگپوری

جواہر ناتھ — ساقی

جوش ملیح آبادی: ۱۴۵، ۱۴۹، ۱۵۱

۳۲۵، ۳۲۴، ۲۲۲

جہانگیر، پوری: ۸۵

چ

چکیت لکھنوی: ۲۸۴، ۳۱۱

ح

حالی، خواجہ: ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹

حبیب الرحمن، مولانا — بیدل

حسان ملک — حفیظ جالندھری

حسرت مرادانی: ۲۸، ۲۵، ۱۲۷، ۱۵۹

۲۷۰، ۲۷۲، ۱۶

شاید عزیز — روش صدیقی

شاه نواز خاں: ۳۷

شہلی، مولانا: ۲۸۲، ۳۲۷

شیر راہ پوری: ۱۰۱

شیر حسن خاں — جوش لیج آبادی

شیر علی خاں بہادر، صاحبزادہ سید شیر

شرر لکھنوی: ۱۳۸

شمس، ابوالقاسم محمد: ۳۲۷

شمس الدین، حافظ: ۱۷۱

شمس الدین احمد، سید: ۹۹

شہاب الدین احمد خاں نواب شہنشاہ

شہناز خاں، سردار: ۲۳۱

شہید (۱۲۲)

شیر شاہ: ۲۶۹

ص

صابر علی خاں — شاکر ٹوکی

صدیق علی، مولوی: ۱۵

صفی لکھنوی (۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹)

۲۵۹، ۲۶۰

صفی، میر سمن: ۱۱۳

صفوی، آغا: ۲۱۲

ض

ضمیر دہلوی: ۲۰۱

ضیاء الدین احمد خاں: ۲۳۳

ط

طالب راہ پوری: ۲۷

طفیل احمد — شاید

طہا سب صفوی، شاہ: ۱۱۳

ظ

ظریف: ۱۸۸

ظریف، معشوق علی: ۲۹۹

ظفر علی خاں، مولانا: ۱۲۷، ۱۸۹

ظہیر الاسلام — مولانا سید: ۱۶۱

ظہیر دہلوی: ۳۰۷

ح

حاشق حسین — سیراب اکبر آبادی

حامد: ۲۱۱

حامد: ۲

حامد شیرانی: ۹۵

حیدر شاہ انصاری، مولوی: ۱۵

حیدر بہادی، مولانا: ۱۶۲

حیدر الحق، مولانا: ۲۸۵

حیدر گلبرگ، مولانا — شیر لکھنوی

حیدر گلبرگ، مولانا

حیدر گلبرگ، مولانا: ۳۲۵

حیدر گلبرگ، مولانا — طالب راہ پوری

عبدالرزاق فرنگی محلی، شاه: ۱۶۲

عبدالسمیع پال — اثر صہبائی

عبدالغفور خاں بہادر، مولوی — تہ آرخ

عبدالقادر جیلانی، سلطان اہل بھارتین خشتا شیخ: ۹۹

عبدالکریم، مولوی حافظ: ۱۳۷

عبید اللہ احرار، خواجہ: ۲۹۹

عبرت: ۲۶۹

عثمان علی خاں بہادر آصفیہ صاحب، حنفیہ

پرنور نواب: ۱۳۸

غریز لکھنوی: ۵۰، ۱۴۹، ۲۷۰

عطارد — آزاد انصاری

علی خاں، حکیم الملک، مرزا: ۴۹

علی حسین خاں، حکیم مرزا: ۴۹

علی سکندر — جگر مراد آبادی

علی قلی خاں شاملو: ۱۱۳

علی نظر، مولوی — نظر

علی نقی، سید — صفی لکھنوی

غ

غالب: ۱۶، ۱۷، ۲۸، ۳۹، ۵۱، ۶۳، ۹۱

۱۱۵، ۱۲۰، ۱۵۰، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵

۱۸۹، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۱۳، ۲۲۲

۲۳۵، ۲۶۱، ۲۷۰، ۲۸۳، ۳۱۱

۳۲۵، ۳۳۷، ۳۴۷

غلام علی موہانی، مولانا: ۱۶۱

غلام قادر گھڑا سی، ملک اشرف مولانا — گرای

ف

فانی بدایونی: ۴۳، ۳۲۵

فراق گورکھ پوری: ۱۵۱، ۱۶۷، ۲۶۹

فرخ سیر، بادشاہ: ۲۸۱

قصاحت جنگ بہادر، نواب — جلیل انگریزی

فہیح الملک — داغ دہلوی

فضل الحسن، سید — حسرت موہانی

فضل حسین، مولوی سید: ۲۵۹

فقیر محمد خاں، نواب — گویا

ق

قاسم علی، مولوی: ۳۳۳

قدرت علی، حافظ: ۳۳۵

ک

کاشف: ۹۹

کالی سہا، ملا: ۳۲۱

کشن پرشاد بہادر، بین السلطنہ مہار

سرف: ۱۳۷

کنہیا لال، پنڈت: ۲۸۱

کیفی دہلوی: ۳۸، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۲

گ

گرامی: ۱۸۲

گورکھ بہ شاد، وکیل — عبرت

گویا: ۱۴۹

نظام رامپوری: ۲۹	نور احمد سہارنپوری، حکیم: ۱۵
نظر: ۱۲۵	نیاز علی پریلوئی، حافظ: ۱۵
نظر وارثی: ۲۴۶	نیرنگ، میرزا: ۳۱۱
نظیر اکبر آبادی: ۱۵۱، ۱۸۹، ۲۲۳	و
۲۳۵	وارث علی، حضرت شاہ: ۲۴۶
نظیر حسین — آزاد انصاری	وحشت کلکتوی: ۳۴۷، ۳۴۵
نصف صاحب — شبیر رامپوری	وحید الدین احمد — ریخود دہلوی
نواب: ۲۳۵	ی
نواب میرزا خاں، فصیح الملک — داغ دہلوی	یاس: ۳
نوح ناروی: ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۶	یگانہ: ۲۷۰، ۳۲۵
نور: ۱۲۵	یوسف علی ناروی، مولوی: ۳۳۵

۲- اقوام و فرق

احمد زئی: ۱۷	سری واسٹیو: ۲۶۹
افغان: ۲۲۱	سکھ: ۱۷۱
انگریز: ۱۷۱، ۱۷۱	قادرسی: ۱۶۲
انصاری: ۱۵	قریشی: ۲۹۹
پٹھان: ۲۷	کالیستھ: ۲۶۹
ثقافت کرڑہ: ۵۰	کشمیری پنڈت: ۳۲۱
حنفی: ۱۶۲	مرہٹے: ۱۷۱
دہاتریہ: ۲۸۲، ۲۸۱	مہند: ۲۲۱
راجپوت: ۱۷۱	یوسف زئی: ۲۲۱

۳۔ مقامات

آگرہ: ۲۳۸، ۲۳۵، ۱۱۳	پانی پت: ۱۷
اجیر: ۲۳۵، ۲۱۲، ۷۳	پرتاب گڑھ: ۱۸۷، ۱۸۷، ۱۸۷
اعظم پور ہاسٹہ: ۱۲۵	پریانواں: ۱۸۷
اکبر آباد۔ آگرہ	پنجاب: ۳۰۹، ۱۷۱، ۱۷۲
اکبر آباد: ۷۵، ۱۸۷، ۲۶۰، ۲۷۰، ۲۷۰	پنجگانواں کاہستہ: ۲۶۹
۳۳۵، ۲۹۹	ٹونک: ۷۵، ۷۳
اہلی والا مکان: ۲۳۵	جہاندر: ۱۷۱
اٹاؤ: ۱۸۷، ۱۷۱	جامع مسجد دہلی: ۲۳۵
اودھ: ۲۵۹، ۱۸۷، ۱۷۱، ۱۷۱	جوالا پور: ۱۹۷
باغیت: ۷۱	جھجھ: ۲۳۱
بالائی قلعہ: ۲۲۱	جینتی اور ہاست: ۲۸۸
پرلی: ۲۱۱	جینت آباد: ۲۳۵، ۲۳۵، ۲۳۵، ۲۳۵
بغداد: ۳۰۲	دکن: ۳۳۵، ۲۳۵، ۲۳۵، ۲۳۵
بلند شہر: ۲۹۹	دلی: ۲۵۰، ۱۷۱، ۱۷۱، ۱۷۱، ۱۷۱
بیبی: ۷	۲۵۵، ۲۵۱، ۲۳۵، ۲۳۵، ۲۳۵
بنارس: ۱۳۷	دیو تریشہ: ۲۳۷
بنگلور: ۱۲۶	ڈیرہ اسماعیل خان: ۳۰۹
میتا اللہ: ۱۰۱، ۱۷۲	راجپوتانہ: ۷۳، ۷۳
بہار پور: ۹۹	رام پور: ۲۵۰، ۲۵۰، ۲۵۰، ۲۵۰، ۲۵۰، ۲۵۰
بیوانی پور: ۳۳۵	رائی گڑھ: ۳۳۱
بھوپال: ۱۳۷	راول پٹی: ۷۵، ۷۳

سیکیمبرج : ۱۴۹	رے بریلی : ۲۱۱، ۲۵۹، ۳۳۵
گلاوٹی : ۱۵۰	سلطان پور : ۲۵۴
گلگت : ۸۹	سلون، تحصیل : ۳۳۵
گورکھپور : ۲۶۹	سہارنپور : ۱۵، ۱۷، ۱۹
گورنمنٹ ہاؤس لاہور : ۶۲	سیالکوٹ : ۳۷، ۸۹
لال قلعہ : ۹۹	سیتاپور : ۱۸۷
لائل پور : ۲۸۲	صوبہ متحدہ : ۱۴۹
لاہور : ۷۱، ۶۲، ۷۳	طبرستان : ۱۱۳
لکھنؤ : ۳۰، ۴۹، ۵۰، ۱۱۳، ۱۳۷، ۱۸۷	عراق : ۴۹، ۳۰۲
۱۸۸، ۲۲۶، ۲۵۹، ۲۸۲، ۳۳۳، ۳۳۴	علی گڑھ : ۱۶۱، ۲۲۱، ۲۹۹
لوہارو : ۳۳۳	علی خیل، موضع : ۳۰۹
مالیر کوٹلہ : ۱۵	فتح پور : ۱۶۱
مانگپور : ۱۳۷	فرخ آباد : ۱۴۹
محمود آباد : ۱۱۴	قائم گنج : ۱۴۹
مراد آباد : ۱۲۵	کابل : ۱۴۹، ۲۲۱
مرنگ، محلہ : ۶۲	کانپور : ۲۲۶
منظفرنگر : ۶۱	کانڈھلہ : ۶۱
ملیح آباد : ۱۴۹	کٹڑہ ابوتراب : ۴۹
موہان : ۱۶۱	کسیرکلاں، قصبہ : ۲۹۹
میانوالی : ۳۰۹	کشمیر : ۵۰، ۴۱، ۲۸۱، ۲۸۴
میرٹھ : ۴۱، ۳۳۳	ککوگلی : ۲۲۵
تاجپا : ۲۸۲	کلمنتہ : ۳۰، ۳۲۱، ۳۴۷
نارہ : ۳۳۵	کلورکوٹ : ۳۱۹

ہرات : ۳۱	ٹانگپور : ۱۵
ہندوستان : ۲۲۱/۳	ٹائی منڈی، محلہ : ۲۲۵
یورپ : ۲۸۴	نیو تینی : ۱۸۷

۴- ادارے

ریوے، محکمہ : ۲۱۱	اسلامیہ کالج کلکتہ : ۳۴۷
سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور : ۳۰۹	آلہ آباد یونیورسٹی : ۲۷۰
علی گڑھ کالج : ۱۶۱	امین آباد ٹائٹ اسکول : ۲۵۹
سینٹ سیفینس کالج دہلی : ۲۸۱-۲۸۲	انجمن ترقی اردو دہلی : ۷۵
فرانس اکیڈمی : ۲۸۳	انڈین اسٹنٹ پولیٹکل اکیڈمی : ۸۹
کانگریس : ۲۷۰	اورینٹل کالج لاہور : ۷۳
کریمین کالج : ۲۷۰	برائچ اسکول لکھنؤ : ۲۵۹
کنڈونٹ بورڈ اسکول : ۳۰۹	بزم سخن رامپور، انجمن : ۲۶۱/۲۳۵، ۱۱۱۳
کیننگ کالج لکھنؤ : ۲۵۹، ۱۸۷، ۲۷۵	بہار ادب لکھنؤ، انجمن : ۲۶۰، ۱۸۸
کیننگ کالج لکھنؤ : ۲۵۹	بھارتی بانی اسکول : ۳۰۹
گورنمنٹ جوبلی انٹر میڈیٹ کالج : ۳۲۱	پنجاب یونیورسٹی : ۶۲
گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ : ۲۲۱	ٹائٹس آف انڈیا پریس ایمیز : ۲۴۵
گیلانی کبڈیچر لاہور : ۶۲	جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ : ۳۲۲، ۳۲۱، ۳۲۹
لال اسکول لکھنؤ : ۲۵۹	چیف کورٹ لکھنؤ : ۱۸۷
نائن پور کالج : ۲۸۴	دارالعلوم حیدر آباد : ۱۶
محکمہ دیوانی اودھ : ۲۵۹	دیال سنگھ کالج لاہور : ۶۲
مدیریت سائنس، ممبئی : ۱۶۱	رامپور اسٹیشن : ۲۸
	ریسکس کتب خانہ دہلی : ۳۳۵

مکتبہ دانش لاہور: ۶۲	مڈل اسکول کلورکوٹ: ۳۰۹
میونسپل بورڈ اسکول: ۳۰۹	مشن کالج سیالکوٹ: ۸۹
ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد: ۲۶۰	مشن ہائی اسکول: ۳۰۹، ۸۹
	معین الادب لکھنؤ، انجمن: ۳۲۲، ۱۸۸

۵۔ کتب

پریم ترنگی: ۲۸۴	آتش خاموش: ۶۳
پیام فردا: ۲۴۷	آئینہ ہند: ۲۸۴
پیام مشرق: ۳۲۲	آیات الادب: ۲۴۷
پیغامات: ۲۴۷	آیات و نعمات: ۱۵۱
پھول مالا: ۱۷۴	اثرستان: ۵۱
پھولوں کا گیت: ۷۵	اردو می معنی، رسالہ: ۱۶۱
تاج سخن: ۱۳۸	اسرارِ حقیقت: ۲۱۳
تذکرہ و تائیفہ، رسالہ: ۱۳۸	اعجازِ نوح: ۳۳۷
تصویر کشمیر: ۱۷۴	امیر اللغات: ۱۳۷
تلخا، شیریں: ۱۷۴	ایشیا، رسالہ: ۲۲۳
تنظیم الحیاۃ: ۲۶۰	بادۂ مشرق: ۲۲۳
تورات مشرق: ۲۴۷	باغِ نظم: ۱۲۵
ٹائٹس آف ہندیا، اخبار: ۲۴۵	بوستان: ۱۷۲
ٹریبون، اخبار: ۲۸۲	بہارِ سن: ۵۱
بادۂ نو: ۶۳	بہارِستان، رسالہ: ۷۳
جامہ صہبائی: ۳۸	بہارِ سکے پھول: ۱۷۷
جامِ غبور: ۳۸	بھارت درپن: ۲۸۴

سوز و ساز : ۱۴۴	جان آرزو : ۴۴
شاهان سلیم : ۱۶۴	جان سخن : ۱۳۸
شہابیات : ۲۲۳	جگہ بیتی : ۲۸۴
شعور و شبنم : ۱۵۱	جلوہ جہاں نما : ۲۱۳
شوکت ہند : ۲۸۴	جنون و حکمت : ۱۵۱
صبح پیار : ۷۵	چراغیں : ۶۳
صبوحی : ۲۲۳	عرف و حکایات : ۱۵۱
زبان نوح : ۳۳۷	حفظ کے گیت : ۱۴۴
نور و نسی : ۳۰۱	خزانہ جاوید : ۲۴۷
فتانہ ترجمید : ۲۱۳	خزانہ کیفی : ۲۸۴
نغین آرزو : ۴۴	خمستان : ۳۸
فکر و نشا : ۱۵۱	وہبہ آصفی : ۱۳۸
نستہ و شاعری : ۳۸	درستوار : ۱۰۱
قرآن مجید : ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵	راحت کدہ : ۳۸
۹۹	رازِ مغفرت : ۲۱۳
کھنڈ و ز : ۲۲۳	روزِ معرفت : ۲۱۳
کھنڈ سیدان : ۳۲۲	روحِ ادب : ۱۵۱
کفر عشق : ۳۳	روحِ سخن : ۱۳۸
کھلم مجید : ۲۱۳	زمانہ رسالہ : ۳۲۲
کھلم محرم : ۳۳۷	مرتاج سخن : ۱۳۸
کھلم عجم : ۳۳۷	سرود غم : ۲۴۷
کھلم عجم : ۳۳۷	سرلی بانسری : ۴
کھلم عجم : ۳۳۷	سفینہ نوح : ۳۳۷

ناگزیر قیل و قال : ۲۸۴

نغمہ حرم : ۷۵

نغمہ راز : ۱۷۴

نفیر فطرت : ۶۳

نقش و نگار : ۱۵۱

نوائے کارگر : ۶۳

نیستان : ۲۴۷

واردات : ۲۸۴

وامق و عذرا : ۹۰

وطن کے گیت : ۲۸

ہمایوں، رسالہ : ۷۳

ہندوستان ہمارا : ۱۷۴

گلستاں : ۱۷۲

گل صد برگ : ۱۳۸

گنج معانی : ۳۱۲

لیلیٰ و مجنوں : ۹۰

ماہر القادری کے سوشل : ۳۰۱

متفرق خمسہ کیفی : ۲۸۴

محبوب الکلام : ۱۳۸

محمود ایتما ماہر : ۳۰۱

مرآۃ خیال : ۲۸۴

مسدس کیفی : ۲۸۴

معارف جمیل : ۱۸

معراج سخن : ۱۳۸

منشورات : ۲۸۴

URDU RESERVED BOOK

CALL No. [۸۹۱۶۳۱۰۴] ACC. NO. ۱۱۳۱۴
 AUTHOR []
 TITLE [ادبیاتِ عربیہ]
 [۱۲۸۸]

Acc. No. ۱۱۳۱۴
 Book No. ۱۲۸۸
 Issued At THE TIME

Wet's	Issue Date	Borrower's No	Issue Date

RESERVED BOOK



MAULANA AZAD LIBRARY
 ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:

1. The book must be returned on the date stamped above
2. A fine of Re 1.00 per volume per day shall be charged for text books and 10 Paise per volume per day for general books kept over-due.

